جامعہ مظاہر علوم کا ترجمان

ماہنامہ

مظاہر علوم

سہارنپور

جلد ۶۴ نمبر

صفر/ ربیع اول ۱۴۴۰ھ / نومبر ۲۰۱۸ء

شمارہ نمبر ۸

سرپرست

حضرت الحاج مولانا محمد طلحہ صاحب مدظلہ

مدیر مسئول

حضرت مولانا سید محمد سلمان صاحب مدظلہ ناظم جامعہ ہذا

نگران

حضرت مولانا سید محمد شاہد صاحب مدظلہ امین عام جامعہ ہذا

مدیر تحریر

مولانا عبداللہ خالد قاسمی خیرآبادی

مجلس ادارت

- مولانا محمد ساجد حسن صاحب مظاہری
- مولانا محمد خالد سعید صاحب اعظمی
- مولانا مفتی شعیب احمد صاحب بستوی
- مولانا مفتی بشیر احمد صاحب سہارنپوری

زرتعاون

فی شمارہ ——— ۱۵/روپے

سالانہ زرتعاون ——— ۱۵۰ روپے

بیرون ملک سالانہ ——— ۲۵ ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور ۲۴۷۰۰۱ (یوپی)

MAZAHIR ULOOM URDU MONTHLY MAGAZINE

SAHARANPUR 247001(U.P.) INDIA

Ph: 0132-2655542

Email-jamiamazahir@gmail.com

اس شمارے میں

○ دائرہ کا سرخ نشان آپ کی مدت خریداری ختم ہونے کی علامت ہے، آئندہ کے لیے رقم ارسال فرمائیں۔

☆ شائع شدہ مضامین سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ جواب طلب امور کے لیے لفافہ اور خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

☆ ماہنامہ، انگریزی ماہ کی ۲/تاریخ کو حوالہ ڈاک کردیا جاتا ہے۔ ۱۰/تاریخ تک موصول نہ ہونے پر مطلع فرمائیں۔

نوائے سحر

تعلیمی انقلاب کی ضرورت

عبداللہ خالد قاسمی خیرآبادی

گذشتہ ہفتہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے مزار پر فاتحہ خوانی کی غرض سے حاضری ہوئی، وہاں پنجاب کے ایک دیہی علاقہ میں قرآنی مکتب اور ایک چھوٹی سی مسجد کے امام صاحب سے ملاقات ہوئی، ان کے حلقہ کی موجودہ دینی صورتِ حال ان سے دریافت کی، اس پر انھوں نے بتایا کہ ابھی کچھ دنوں پہلے ایک شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ چلو میری لڑکی کا نکاح پڑھا دو، اور بہت ہی بضد ہو گیا، امام صاحب بتا رہے تھے کہ مجھے تعجب ہوا اور حیرت ہوئی کہ نکاح تو لڑکے کا پڑھایا جاتا ہے، یہ لڑکی کا نکاح پڑھانے کی ضد کر رہا ہے، جب میں نے لوگوں سے معلومات کیں تو پتہ چلا کہ اس علاقہ میں یہی ہوتا ہے، نکاح خواں لڑکی کے پاس جاتا ہے اس سے کلمہ پڑھواتا ہے اور اس سے اس نکاح کی اجازت لیتا ہے، یہ ہے لڑکی کا نکاح!!!!

امام صاحب یہ واقعہ بتا رہے تھے اور میں وہاں کے لوگوں کی دین سے دوری کے خوفناک نتائج کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ نکاح جیسی اہم بنیادی ضرورت اور معاشرہ کا ایک ایسا فعل جس سے مفر ممکن ہی نہیں، اس اہم طریقۂ اسلامی سے بھی اس قدر ناواقفیت، پھر زاویۂ فکر و نظر تبدیل کیا اور یہ سوچنے لگا کہ آخر اس خطرناک صورت حال اور اس قدر اہم معاشرتی ضرورت سے ناواقفیت کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

ان حالات کی اصل اور بنیادی وجہ دین اور دینی تعلیم کا ماحول نہ ملنا ہے، لوگوں کے دلوں میں دینی تعلیم کی اہمیت نہیں رہی حالانکہ دینی علوم ہی کے ذریعہ انسان کو عرفان الٰہی جیسی عظیم نعمت حاصل ہو سکتی ہے، شاہراہِ حیاتِ انسانی تابندہ و درخشاں ہوتی ہے اور

انسانیت کو دنیا وآخرت کی فوز وفلاح حاصل ہوتی ہے، اسلامی اقدار وروایات کا شعور دینی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہے، صحیح عقائد اور دین کی بنیادی جانکاری کے بغیر نہ اسلام کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ اس کے احکام کی صحیح معنوں میں تعمیل کی جاسکتی ہے، اور مسلمانوں کی معاشی، سماجی، تعلیمی اور سیاسی زبوں حالی کی بنیادی اور اصل وجہ مسلمانوں کا اپنے مرکز، اپنی اساس اور اپنی بنیاد، دین سے دوری، قرآن وسنت، اسلامی تعلیمات، اسلامی شعائر اور دینی اقدار سے ناواقفیت ہے۔

آج اسلامی فکر وتہذیب کا بقاء واستحکام کس قدر خطرے میں ہے اس کا اندازہ خوب کیا جارہا ہے، ہمارے ملک ہندوستان کی موجودہ بدلتی ہوئی صورتِ حال سے ہر صاحب فہم و ادراک واقف ہے۔

امت مسلمہ علمی، تہذیبی، سماجی، معاشی، دفاعی اور سیاسی شعبوں میں اپنی برتری ایک ہزار سال تک برقرار رکھنے کے بعد جب زوال پذیر ہوئی تو اس کے دو بنیادی اسباب تھے، ایک تو اس کی اپنے نظریہ حیات سے مستحکم وابستگی میں کمزوریاں درآئیں اور دوسرے اس کی حریف صلیبی اور یہودی قوتوں کی سازشیں، جنہوں نے نہ صرف مسلم معاشرے کو مغلوب کیا بلکہ اس پر قبضہ کرکے اسے اپنے فکر ونظر کے مطابق بدل ڈالا تاکہ مسلمان آئندہ کبھی سر نہ اٹھاسکیں اور ہمیشہ ان کے غلام رہیں، استعماری طاقتیں اپنے اس منصوبہ میں بڑی حد تک کامیاب ہوگئیں اور مسلمانوں کی عملی کمزوری سے انھوں نے فائدہ اٹھا کر اپنے نظریہ اور فکر کی ترویج کی، دینی مزاج اور صحیح الفکر افراد اور جماعتوں نے اس دام ہمرنگ زمین کو سمجھنے اور امت مسلمہ کو سمجھانے کی کوششیں اور اس سے ممکنہ حد تک بچنے کی تدابیر بھی اختیار کرکے امت کو اس سے روسناش کرایا، لیکن مغرب کا یہ ریلا اتنی تیزی سے آیا کہ تمام تر کوشش اور جدوجہد بے کار تو نہیں البتہ کم اثر ثابت ہوئیں۔

تعلیم ایک خاموش انقلاب لاتی ہے اس کے لیے نعروں کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کے

لیے کسی اسلحے اور ایٹم بم کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے حکومتی امداد کی بھی ضرورت نہیں، مقامی مسلم آبادی کو متحرک کیا جائے اور انہیں تعلیم وتربیت کی اہمیت بتائی جائے تو یقیناً اتنے وسائل مہیا کئے جاسکتے ہیں جن سے معقول دینی تعلیم کا نظم کیا جاسکے۔ جہاں سے بڑی تعداد میں ایسے افراد تیار ہونا شروع ہوجائیں گے جو اپنی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والے ہوں گے اور وہ اسلامی اقدار کے پشتیبان ہوں گے، اسلامی اقدار وروایات سے واقف ہوکر پورے معاشرے کے لئے رہبر ورہنما ثابت ہونگے۔

معاشرہ چونکہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے لہٰذا اگر فرد کی صحیح تعلیم وتربیت کا فعال اور مؤثر نظام وضع ہوجائے تو معاشرے کے سدھرنے اور صحیح سمت میں اس کی پیش رفت کے امکانات غالب ہوجائیں گے، معاشرے کی ترقی اور عروج کے لیے فرد کی اصلاح اور ترقی نہ صرف اسلامی اصولوں کے مطابق ہے بلکہ فطری اصول کے عین مطابق بھی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جب مسلمان دین حق سے منحرف ہوگئے، اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ روشن ہدایات وتعلیمات سے چشم پوشی اختیار کرلی، احکام خداوندی سے روگردانی کرلی، دنیا پرستی، عیش پسندی، جھوٹی شان وشوکت کے دلدادہ ہوگئے، مختلف قسم کے آپسی اختلافات میں مبتلا ہوگئے، یہود ونصاریٰ اور دوسری قوموں کی نقالی شروع کردی، انہیں دوست بنانے اور ان کی حمایت کے حصول کے لیے ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے شروع کردیئے اور یہود و نصاریٰ اور دوسری قوموں کی ان تمام خرابیوں اور برائیوں میں مبتلا ہوگئے، جن سے انتہائی سخت تاکید کے ساتھ باز رہنے کو کہا گیا تھا، ایسی صورت میں وہی دشمن عناصر اور وہ قومیں جنہیں مغضوب اور ضالین کے خطابات سے نوازا گیا تھا، نظام عالم پر بڑی ہی آسانی اور سرعت کے ساتھ قابض اور متصرف ہونے لگیں، یہ سب اس لیے ہوا کہ مسلمانوں میں دینی تعلیم کے حصول کا رجحان ختم ہوگیا ہے جس کی وجہ سے لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کو بھلا دیا، اسلامی اقدار وروایات سے دور ہوتے چلے گئے، قرآن کریم میں تو خالق

اکبر جل مجدہ صاف صاف اعلان کررہا ہے

وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک (النسائ: ۷۹)

''اور جو بھی مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرا اپنے کسب وعمل کی بدولت ہے''۔

ان اللہ لا یظلم الناس شیئا و لکن الناس انفسھم یظلمون (یونس: ۴۴) ''حقیقت یہ کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں''۔

اوران کی یہ حالت اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک کہ اس کے بدلنے کے لیے خود کو نہ بدلا جائے: **ان اللہ لا یغیر مابقوم حتی یغیر و امابانفسھم** (الرعد: ۱۱) بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی''۔

اغیار کا ظلم، دشمنان اسلام کی مذموم سازشیں، کفار ومشرکین کی مخالفتیں ان سب کا صرف ایک سبب ہے اور وہ مسلمانوں کا دینی تعلیم سے دور ہونا، آج مسلمان اپنے عمل وکردار سے دنیا کو دین بیزار باور کرارہے ہیں، مادیات کی چمک دمک کے دلدادہ ہوتے جارہے ہیں، مسلمانوں کو اپنی تو اپنی اپنی نئی نسل تک کی بھی پرواہ نہیں ہے، دینی تعلیم کے حصول سے دور رکھ کر غیروں کے ترتیب دیئے ہوئے تعلیمی نظام سے ان کو مربوط کرکے ان کا مستقبل تاریک سے تاریک تر بناتے جارہے ہیں، اوران سے اسلامی اقدار روایات کے تحفظ کے خواہاں ہیں۔

مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ان کی ذاتی بے حسی، جدو جہد کی کمی اور جہالت ہے، اس کی وجہ سے امت میں تعلیمی انقلاب کا جذبہ جس انداز سے ہونا چاہیئے وہ حاصل نہیں ہو پارہا ہے، تعلیمی اور معاشی پسماندگی دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلم امت خود بیدار ہو، اوراسے اپنا اہم مسئلہ سمجھ کر جدو جہد کرے۔

طابع وناشر وایڈیٹر (مولانا) محمد سلمان (صاحب) ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور نے سہارنپور الیکٹرک پریس سہارنپور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور سے شائع کیا

درسِ قرآن

ایک بری خصلت

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ

لَاتَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا وَیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلاَ تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (سورہ آل عمران، ۱۸۱)

جو لوگ ایسے ہیں کہ اپنے کام پر خوش ہوتے ہیں اور جو کام نہیں کیا ہے اس پر چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو، سو ایسے شخصوں کو ہرگز ہرگز مت خیال کرو کہ وہ عذاب سے بچاؤ میں رہیں گے، اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''یہود غلط مسئلے بتاتے، رشوتیں کھاتے اور پیغمبروں کی صفات و بشارات جان بوجھ کر چھپاتے پھر خوش ہوتے کہ ہماری چالاکیوں کو کوئی پکڑ نہیں سکتا، اور امید رکھتے ہیں کہ لوگ ہماری تعریف کریں کہ بڑے عالم اور دیندار حق پرست ہیں دوسری طرف منافقین کا حال بھی ان کے مشابہ تھا، جب جہاد کا موقع آتا، گھر میں چھپ کر بیٹھ رہتے، اور اپنی اس حرکت پر خوش ہوتے کہ دیکھو کیسے جان بچائی، جب حضور جہاد سے واپس تشریف لاتے تو غیر حاضری کے جھوٹے عذر پیش کرکے چاہتے کہ آپ سے اپنی تعریف کرائیں، ان سب کو بتلادیا گیا کہ یہ باتیں دنیا و آخرت کے عذاب سے چھڑا نہیں سکتیں، اول تو ایسے لوگ دنیا میں فضیحت ہوتے ہیں، اور کسی وجہ سے یہاں بچ گئے تو وہاں کسی تدبیر سے نہیں چھوٹ سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہود اور منافقین کی ایک بری خصلت کا ذکر فرما کر اس

پر عذاب الیم کی وعید سنائی ہے، یہ خصلت چونکہ خاص طور پر یہود اور منافقین میں پائی جاتی تھی، اس لئے ان کا ذکر خصوصیت سے آیا ہے، ورنہ درحقیقت یہ خصلت ہی محل وعید ہے، اور مسلمانوں کو بھی بڑے اہتمام سے اس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے، کیونکہ اللہ کا یہی حکم ہے، اور اسی کے مطابق ہر مسلمان کی دعا ہے کہ جس قوم پر اللہ کا غضب ہوا ہے، اس راستے سے اللہ تعالیٰ ہم کو بچائے ہی رکھیں، تو جو آیت یہود اور منافقین کو ان کی کسی عادت بد پر دھمکی سنا رہی ہو، مسلمان یہ کہہ کر مطمئن نہیں ہوسکتے کہ یہ بات ہم کو نہیں کہی گئی ہے، قرآن جو اہل تقویٰ کے لئے نسخۂ ہدایت ہے اس کی کسی آیت سے مسلمان صرف اس لئے کیوں کر صرف نظر کرسکتا ہے کہ اس میں فلاں قوم کا ذکر ہے۔

اس اس آیت پر اور اس کے مضمون پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے اور ہم اسلام کے نام لیواؤں کو دیکھنا چاہئے کہ ہمارے افراد میں اور ہمارے اجتماعی معاشرہ میں یہ مرض پھیلا ہوا تو نہیں ہے؟ انفرادی طور پر ہمارا یہ حال دیکھنے میں آرہا ہے کہ آدمی گناہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑتا ہے، کسی نے کسی کو ستایا، اس کا مال دبایا، کسی کی زمین غصب کی، کاروبار میں کسی کو دھوکہ دیا، قرض لیا اور ادا کرنے میں ٹال مٹول کیا، یا بالکل ہی ادا نہیں کیا، نماز کو ترک کیا، روزہ سے جان بچائی، زکوٰۃ کا مال ہضم کرلیا، یہ سب وہ گناہ ہیں، جن کے گناہِ کبیرہ ہونے میں کسی مسلمان کو تردد نہیں ہے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ ان پر شرمندگی تو کیا ہوتی؟ ان کے کرنے پر آدمی جھینپتا تو کیا؟ الٹے ان پر فخر کیا جاتا ہے، اپنی چالاکی اور عقلمندی کی شہادت انھیں سمجھا جاتا ہے، اور یہ بات کوئی اکادکا واقعات کی صورت میں نہیں ظاہر ہوتی، بلکہ اس کا عام چلن ہے۔

اور اجتماعیت کا حال دیکھئے تو اور بھی دگرگوں ہے، آج کل اجتماعیت نام ہے تنظیموں کا، جماعتوں کا، انجمنوں کا، اداروں کا، مکاتب فکر کا، یہاں سیاسی پارٹیوں اور بے دینی کے جتھوں کا ذکر نہیں ہے، ان اداروں اور جماعتوں کا ذکر ہے، جو مسلمانوں کی خدمت کیلئے ان کی صحیح رہنمائی کیلئے قائم ہوئی ہیں، ان کی تحریریں

پڑھئے، ان کی تقریریں سنئے، کیاان میں یہ مرض نظرنہیں آتا؟ کیا ایسانہیں ہے کہ الٹا سیدھا جوکام ان سے وجود میں آتا ہے چاہے وہ مسلمانوں کے حق میں مضر ہی ہو، خواہ اس سے اللہ تعالیٰ کی صریح نافرمانی ہی ہوتی ہو،لیکن ان پرتحریراً وتقریراً خوشی بلکہ فخر کا اظہار کیا جاتا ہے اور جوکام نہیں کیا ہے، امیدوار رہتے ہیں کہ ان پر ان کی مدح وستائش ہوگی، بلکہ اب تو اس کا بھی انتظار نہیں ہوتا کہ دوسرے ہمارے کئے کاموں پر ہماری مدح سرائی کریں، بھلا اس کا انتظار کون کرے، ہمارا اجتماعی معاشرہ اس سے ترقی کرکے خود ہی اپنی مدح وستائش کا راگ الاپتا ہے، اور نام اس خودستائی کا ''تعارف'' رکھا جاتا ہے، اور یہ تاویل کی جاتی ہے زمانہ تشہیرو پروپیگنڈے کا ہے، اس کے بغیر کام اور نام دب جاتا ہے، ممکن ہے یہ تاویل کسی حدتک درست ہو، لیکن غور کرنے والے غور کریں کہ کہیں یہ یہود ومنافقین کی پیروی تو نہیں ہے؟ بالخصوص اس وقت جب کہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے، کہ بہت سے ادارے، بہت سی انجمنیں ان خوبیوں سے خالی ہوتی ہیں، ان کا اندرونی نظام خود ان کے کارکنوں کیلئے باعث مصیبت بنا ہوتا ہے، وہ خود تفرق وانتشار کا شکار ہوتی ہیں، ان کی بےعملی اور ناکارگی کی شکایتیں عام ہوتی ہیں،لیکن جب تعارف شائع ہوگا تو اس طرح شائع ہوگا کہ جیسے دین کی اور مسلمانوں کی خدمت ان کے علاوہ کسی اور جانب سے ہوتی ہی نہیں، کتنے مکاتب فکر ہیں، جو اپنی ظاہری وباطنی غلطیوں کے باوجود خود کو معصوم ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں، یہ صورت حال خودستائی اور اپنی مدح سرائی کی بہت تشویشناک ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، هُوَ أَعْلَمُ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَإِذْ أَنْتُمْ أَجِنَّةٌ فِي بُطُوْنِ أُمَّهَاتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم، ۳۲) تم کو وہ خوب جانتا ہے جب بنا نکالا تم کو زمین سے، اور جب تم بچے تھے ماں کے پیٹ میں، سومت بیان کرو اپنی خوبیاں، وہ خوب جانتا ہے، اس کو جو بچ کر نکلا۔(ترجمہ شیخ الہند)

یعنی اگر تقویٰ کی کچھ توفیق اللہ نے دی تو شیخی نہ مارو، اور اپنے کو بہت بزرگ نہ بناؤ وہ سب کی بزرگی اور پاکیزگی کو خوب جانتا ہے اور اس وقت سے جانتا ہے جب تم نے ہستی کے اس دائرہ میں قدم بھی نہ رکھا تھا، آدمی کو چاہئے کہ اپنی اصل کو نہ بھولے جس کی ابتدا مٹی سے تھی پھر بطن مادر کی تاریکیوں میں ناپاک خون سے پرورش پاتا رہا،

اس کے بعد کتنی جسمانی وروحانی کمزوریوں سے دوچار ہوا، آخر میں اگر اللہ نے اپنے فضل سے ایک بلند مقام پر پہونچادیا تو اس کو اس قدر بڑھ چڑھ کر دعویٰ کرنے کا استحقاق نہیں، جو واقعی متقی ہوتے ہیں، وہ دعویٰ کرتے ہوئے شرماتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب بھی پوری طرح کمزوریوں سے پاک ہوجانا بشریت کے حد سے باہر ہے، کچھ نہ کچھ آلودگی سب کو ہوجاتی ہے الا من عصمہ اللہ (فوائد عثانی)

یہ بات جس طرح ایک فرد کے حق میں صحیح اور قابل غور ہے، اسی طرح اجتماعی اداروں کے اوپر بھی منطبق اوران کیلئے لائق توجہ ہے۔ واللہ ولی التوفیق

ساری دنیا صحیح رہنما پا گئی

ہو مبارک تجھے اے دلِ مضطرب!، آج یاد نبی تجھ کو گرما گئی
ہوگیا ہے تو اب بے نیاز جہاں راستے پر تری زندگی آگئی

ہر طرف تھیں جہالت کی تاریکیاں، مضمحل مضطرب تھے سبھی انس وجاں
آپ تشریک لائے اے فخرِ جہاں، ساری دنیا صحیح رہنما پا گئی

شعلہ زن چار سو ظلم کی بھٹیاں، خون آشامیاں اور سرمستیاں
آسمانِ ہدایت پہ پھر یک بیک رحمتِ حق کی کالی گھٹا چھا گئی

صنفِ نازک کی مت پوچھئے بے کسی، وہ مظالم کی چکی میں پیسی گئی
آخرش غیرت حق کو جنبش ہوئی، عرشِ اعظم سے سورہ نسا آگئی

کوہِ فاران سے ایک بادل اٹھا، جس کے دامن میں تھی راحت افزا ہوا
عارفؔ خوش نوا مرحبا مرحبا، روحِ انسانیت تازگی پا گئی

کلام: حضرت مولانا فضل حق عارفؔ خیرآبادی

انوارِ حدیث

جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے...

مولانا محمد خالد سعید اعظمی استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

خطبۂ جمعہ کے دوران کلام کی ممانعت

عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا قلت لصاحبك أنصت يوم الجمعة والإمام يخطب فقد لغوت (رواہ البخاری ۱/۱۲۷، مسلم ۱/۱۸۱، ابوداود ۱/۱۵۸)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم جمعہ کے دن اپنے ساتھی سے کہتے ہو خاموش رہ! اس حال میں کہ امام خطبہ دے رہا ہے تو تم نے لغو کام کیا۔

اس حدیث میں خطبۂ جمعہ کے دوران گفتگو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی بات کرنے والے سے یہ کہے کہ چپ رہو، تو اسے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لغو کام قرار دیا ہے، یعنی زبان سے خاموش کرانے کا عمل بھی لغو ہے اور لغو کا مطلب یہاں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ شخص جمعہ کی فضیلت اور اس کے اجر وثواب سے محروم رہے گا، اب خود سوچیں کہ جب خاموش کرانے والے کا یہ حال ہے تو بات چیت کرنے والوں کا کیا حال ہوگا؟!

اسی لئے فقہا نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ جب امام خطبہ دینے کے لئے اپنے حجرے سے نکلے اگر اس کا حجرہ مسجد میں ہو ورنہ جب منبر پر جانے کے لئے کھڑا ہو اور ایک قول یہ ہے کہ جب منبر پر چڑھ جائے تو اب کوئی نماز جائز نہیں ہے خواہ وہ سنن ونوافل ہوں یا نماز جنازہ اور سجدۂ تلاوت یا نذر مانی ہوئی نماز، یا فوت شدہ نماز کی قضاء، البتہ اگر کوئی صاحبِ ترتیب ہو اور دورانِ خطبہ اسے فوت شدہ نماز یاد آجائے تو وہ اس وقت اس کی قضاء کرسکتا ہے بلکہ اس کے لئے قضاء ضروری ہے تاکہ اس کی جمعہ کی نماز صحیح ہو سکے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امام کے

خطبہ کے لئے اٹھنے سے پہلے نماز شروع کرنا مکروہ نہیں ہے اور اگر اس نماز کے دوران امام خطبہ شروع کردے تو بلا کراہت نماز کو پوری کرنا جائز ہے، ہاں اگر نفل نماز ہو تو دو رکعت پر سلام پھیر دینا چاہئے اور اگر تیسری کے لئے کھڑا ہو چکا ہو تو چار مکمل کرے، البتہ اگر جمعہ سے قبل کی سنت نماز ہو تو صحیح قول کے مطابق بجائے دو رکعت پر سلام پھیرنے کے چار رکعت مکمل کرے اور قراءت میں تخفیف کر کے بقدر واجب پر اکتفا کرے اور جلد نماز پوری کرے۔

اسی طرح جب امام خطبہ دینے کے لئے منبر پر جانے کے لئے کھڑا ہو تو امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک دنیوی و دینی ہر قسم کا کلام ممنوع ہے حتی کہ زبان سے ذکر و تسبیح کرنا بھی درست نہیں، اور اذان ثانی کا جواب بھی زبان سے نہ دے بلکہ دل ہی دل میں جواب دے (فتاویٰ محمودیہ ۱۲/۱۷۷-۱۸۶)، البتہ صاحبین کے نزدیک خطبہ شروع ہونے سے پہلے اور امام کے خطبہ کے بعد منبر سے اترنے کے بعد تکبیر کہنے سے پہلے دینی کلام جائز ہے، لہٰذا اذان کا جواب بھی دے سکتے ہیں، اور خطبہ شروع ہونے کے بعد بالاتفاق دینی و دنیاوی دونوں کلام ممنوع اور مکروہ تحریمی ہے، یہاں تک کہ اگر امام دوران خطبہ دعا کرتا ہے تو لوگوں کے لئے ہاتھ اٹھانا اور زبان سے آمین کہنا بھی جائز نہیں ہے اور ایسا کرنے والا گناہ گار ہوگا ،اسی طرح جب امام خطبہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرے تو لوگ دل ہی دل میں درود پڑھیں زبان سے درود پڑھنا جائز نہیں۔

اسی طرح اس حال میں سلام کا جواب دینا، امر بالمعروف کرنا، چھینکنے والے کا جواب دینا، کھانا پینا اور ہر وہ کام ممنوع ہے جو نماز میں ممنوع ہے اور یہ سب چیزیں امام کے خطبہ کے لئے نکلنے سے لے کر نماز جمعہ سے فراغت تک ممنوع ہیں، خطبہ کے وقت مکمل خاموشی اور غور سے خطبہ سننا واجب ہے اور کسی بھی ایسے امر میں مشغول ہونا جو خطبہ کے سننے میں مخل ہو وہ مکروہ ہے خواہ امام سے دور ہو یا نزدیک، البتہ منکر کو دیکھ کر سر یا ہاتھ کے اشارے سے منع کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے (حاشیۃ الطحطاوی ۵۱۸-۵۲۰، ردالمحتار ۳/۳۱-۳۳)

مدارس اسلامیہ کے تعلق سے

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ

مولانا محمد سلمان بجنوری

مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدارس اسلامیہ اپنے روزِ قیام ہی سے دو قسم کی ذہنیتوں کا نشانہ رہے ہیں: ایک تو وہ جس نے مدارس کے وجود کو کبھی قبول ہی نہیں کیا اور ان کو اپنے مذموم مقاصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا، یہ استعماری یا کفریہ طاقتوں کی نمائندگی کرنے والی ذہنیت تھی، اس کو چوں کہ مغلیہ سلطنت کے بعد مسلسل اقتدار کی علانیہ یا خفیہ سرپرستی حاصل رہی یہاں تک کہ آزادی کے بعد بدلے ہوئے اقتدار میں بھی کم وبیش وہی صورت حال رہی اس لیے مدارس کے خلاف اس کی سرگرمیاں زیادہ راست طور پر اور کھلی مخالفت کے انداز میں سامنے آتی رہیں، اور اُن سے اگرچہ مدارس کو نقصان بھی پہنچتا رہا؛ لیکن اس نقصان کی نوعیت ایسی ہی تھی جیسی کھلے دشمن سے پہنچنے والے نقصان کی ہوتی ہے، کہ اس سے متاثر ہونے والا، خواہ کتنا ہی نقصان اٹھا رہا ہو، ہمدردی سے محروم نہیں ہوتا اور اس کے وجود پر سوالیہ نشان کھڑا نہیں ہوتا؛ بلکہ بسا اوقات ہمدردی میں اضافہ ہی ہوجاتا ہے۔

لیکن مدارس کے خلاف کام کرنے والی دوسری ذہنیت اگرچہ دوسروں کی نمائندہ نہ ہو اور اس کو اُن کا آلۂ کار بھی نہ کہا جاسکتا ہو؛ لیکن وہ کام اُن ہی کا کرتی ہے اور اس کی محنت سے پہنچنے والا نقصان بھی مدارس کو کمزور کرکے بالواسطہ غیروں ہی کی خدمت انجام دیتا ہے اور چوں کہ وہ اپنوں کی جانب سے ہوتی ہے، اس لیے وہ بہت سے اپنے لوگوں کو متاثر کردیتی ہے، اس لیے اس کی سنگینی نتائج کے اعتبار سے زیادہ ہوجاتی ہے۔

سر دست اسی دوسری ذہنیت کے اٹھائے ہوئے چند نکات پر اختصار کے ساتھ کچھ عرض کرنا ہے۔

اس ذہنیت کے حاملین جو عام طور پر اپنے ہی لوگوں میں سے ہوتے ہیں، اُن کی نیت کے بارے میں تو کچھ کہنا مناسب نہیں، اگر چہ اُن میں سے بعض کا جارحانہ انداز اُن کی نیت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرتا ہے؛ لیکن اس کو نظر انداز کر کے نفس مضمون پر ہی بات کرتے ہیں، اس لیے اُن میں کسی کی تعیین بھی نہیں کی جارہی ہے، اگر چہ اُن کو تلاش کرنا اور پہچاننا مشکل نہیں ہے، ایسے لوگ کسی بھی عصری تعلیم کے ادارے میں یا کسی بھی اخبار کے کالموں میں آسانی کے ساتھ مل سکتے ہیں۔

اس قسم کے حضرات کی تحریروں، کتابوں اور مقالات ومضامین میں یوں تو طرح طرح کی باتیں مختلف انداز سے کہی جاتی ہیں؛ لیکن بنیادی طور پر اُن کو چند مرکزی نکات میں سمیٹا جا سکتا ہے۔

(۱) نصاب تعلیم: مدارس کے بارے میں خامہ فرسائی کرنے والے اکثر حضرات کی گفتگو اکثر وبیشتر یا زیادہ شدت کے ساتھ نصاب تعلیم کے مسئلے پر ہوتی ہے، اُن کے خیال میں مدارس کا نصاب تعلیم فرسودہ، از کار رفتہ اور جمود کا شکار ہے، جس کو مدارس نے تقدس کا درجہ دے کر ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھا رکھی ہے اور وہ تین سو سال پرانے اس نصاب کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔

اس سلسلے میں نہایت اختصار کے ساتھ صرف دو باتیں عرض کی جاتی ہیں: پہلی بات تو یہ کہ نصاب میں کسی بھی قسم کی تبدیلی نہ کرنے کا الزام، درحقیقت ناواقفیت پر مبنی ہے، اگر یہ حضرات صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کے نصاب اور آج کے نصاب کا موازنہ کر لیں تو بے شمار تبدیلیاں نظر آجائیں گی اور جہاں تبدیلی نظر نہیں آتی اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ توجہ نہیں ہوئی؛ بلکہ وہاں تبدیلی کو مدارس کے مقاصد سے ہم آہنگ نہیں سمجھا گیا؛ اس لیے تبدیلی نہیں کی گئی۔

دوسری بات مقاصد ہی سے متعلق ہے اور مدارس کے نصاب پر غور کرنے کے باب میں

یہی بنیادی نکتہ ہے اور وہ یہ کہ مدارس کی حیثیت محض ایک تعلیمی ادارہ کی نہیں ہے جو کچھ لوگوں کو پڑھانے لکھانے کے لیے قائم کیا گیا ہو؛ بلکہ اُن مدارس کا مرکزی مقصد علوم اسلامیہ کی حفاظت یا بالفاظ دیگر، نبوت کی علمی میراث کو اس کی حقیقی روح اور مکمل مزاج کے ساتھ محفوظ رکھنا اور اگلی نسلوں تک منتقل کرنا ہے، یہ کوئی سائنس کا نصاب نہیں ہے جس کی حفاظت ہی تبدیلی میں ہے اور اس کی ترقی کا راز ہی اس کا روز بروز نئی شکل اختیار کرنا اور نئے نئے تجربات سے مستفید ہونا ہے، اس کے برخلاف علوم نبوت کا تو سارا اعتبار اُن کی قدامت ہی میں ہے، اس لیے اس نصاب کو اسکول کالج کے نصاب پر قیاس کرنا بڑی نادانی کی بات ہے۔

ہاں اپنی ضروریات کی حد تک طالب علم کی معلومات میں اضافہ کرنا ایک ضرورت ہے جس پر عام طور پر مدارس میں توجہ بھی ہے اور اس سے بڑھ کر بلند پایہ دعوتی مقاصد کے لیے ضروری علوم، معلومات اور زبانوں کا معاملہ ہے، اس کے لیے تخصص کے انداز پر کام ہونا چاہئے اور کسی درجہ میں ہو بھی رہا ہے، پھر یہ کام مدارس کے متعینہ نظام سے الگ بھی کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ معتبر علماء کی نگرانی میں ہو تو اس ضرورت کی تکمیل بھی ہوجائے گی۔

(۲) معیارِ تعلیم کا مسئلہ: بعض لکھنے والوں کی تحریرات میں مدارس کے معیارِ تعلیم پر بھی بات آتی ہے یہ بات اگرچہ وہ زیادہ منصفانہ انداز سے پیش نہیں کرتے؛ لیکن پھر بھی یہ بات قابل توجہ ہے، منصفانہ انداز سے مراد یہ کہ یہ صرف مدارس کا مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ ہر شعبۂ تعلیم اس انحطاط کا شکار ہے اور اس کے کچھ ایسے اسباب بھی ہیں جو پہلے اس درجہ میں نہیں تھے، آج کے دور میں انٹرنیٹ کے ذریعہ ہر شعبۂ زندگی میں جو تبدیلی آئی ہے اور اس کی وجہ سے جو نارواترغیبات اور خرمن ایمان واخلاق؛ بلکہ خرمن عقل کو خاکستر کردینے والی جو مسموم آگ پھیلی ہوئی ہے وہ صرف معیارِ تعلیم ہی نہیں؛ بلکہ اس سے پہلے اور اس سے بڑھ کر نظام تربیت کے لیے مہلک ثابت ہوئی ہے اور یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے؛ لیکن اس کے باوجود معیارِ تعلیم اور معیارِ تربیت دونوں کے سلسلے میں سنجیدگی اختیار کرنا اور اس کے لیے

عملی صورتیں اختیار کرنا مدارس کے لیے ازبس ضروری ہے، جس کی طرف دارالعلوم دیوبند کی جانب سے پوری ذمہ داری کے ساتھ رابطۂ مدارس اسلامیہ عربیہ کے پلیٹ فارم سے توجہ دلائی جاتی رہتی ہے اور عملی کوششیں جاری ہیں۔

(۳) مالیات کا مسئلہ: اس سلسلے میں کئی طرح کی باتیں سامنے آتی ہیں، پہلی تو زکوٰۃ سے متعلق ہے، کچھ لوگوں کو مدارس کا زکوٰۃ وصول کرنا ہی ناپسند ہے؛ حالانکہ مدارس میں آ کر زکوٰۃ اُس طبقے تک پہنچتی ہے جو مستحق ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیم وتعلّم کے افضل ترین عمل میں مشغول ہے، ہاں اس سلسلے میں اصول کی رعایت ضروری ہے اور جہاں اس میں کوتاہی ہو اس کی اصلاح واجب ہے۔

مدارس کی مالیات کے باب میں سرکاری امداد کا مسئلہ بھی زیر بحث آتا ہے، اس سلسلے میں سرکاری امداد لینے والے مدارس کی کارکردگی اگر مطلوبہ شرائط اور معیار کے مطابق نہ ہو تو اس پر تنقید بجا ہے؛ لیکن اس کے دائرے میں اُن مرکزی اداروں کو نہیں لایا جا سکتا جو روزِ اوّل سے اس کے مخالف ہیں؛ حالانکہ یہاں پر یہ بھی عجیب بات ہے کہ بعض لکھنے والوں نے سرکاری امداد نہ لینے کے رجحان کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوری دور میں عوامی پیسہ سے ملنے والی امداد قبول ہونی چاہئے؛ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ امداد دے کر اپنی بات منوانے کا جبر کرنے میں جمہوری حکومتیں سلطانی ایوانوں سے پیچھے نہیں ہیں جس کے مفاسد سے شاید ہی کوئی ناواقف ہو، اسی لیے دارالعلوم دیوبند اور اس کے ہم خیال تمام مرکزی مدارس، سرکاری امداد لینے یا مدرسہ بورڈ سے الحاق کرنے کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔

مدارس کی مالیات کے موضوع پر بات کرتے ہوئے یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ ملت اسلامیہ کی دینی ضروریات کی تکمیل کرنے والے اداروں کی حیثیت سے مدارس اور اُن کے خدام کی مالی یا معاشی کفالت تو قدرتی طور پر ملت کی ذمہ داری ہے (اور ملت ماشاء اللہ یہ ذمہ داری ادا بھی کر رہی ہے) تو اس کو موضوع بحث بنانا کہاں کا انصاف ہے؟

مذکورہ بالا تین نکات پر اختصار کے ساتھ یہ چند سطور لکھی گئی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان تین امور پر اور ان کے علاوہ بہت سے موضوعات پر تفصیلی اور منصفانہ گفتگو کی ضرورت ہے؛ مگر محسوس ایسا ہوتا ہے کہ مدارس کے بارے میں بات کرتے ہوئے عام طور پر گہرے غور وفکر یا ضروری سنجیدگی سے کام نہیں لیا جاتا۔

ابھی چند ماہ قبل ایک معروف صاحب قلم نے مدارس کے مستحق زکوٰۃ ہونے پر بحث کرتے ہوئے استحقاق زکوٰۃ کے لیے ایک نیا معیار مقرر فرمایا جس کی رو سے نصاب تعلیم میں انگریزی زبان وعصری علوم کی شمولیت کو استحقاق زکوٰۃ کی شرط قرار دیا اور اپنے اس مزعومہ معیار کے مطابق چند مدارس کی فہرست بھی تحریر فرمائی جو اُن کے خیال میں زکوٰۃ کی رقم کا صحیح مصرف ہیں، لطف کی بات یہ کہ اس میں نہ دارالعلوم دیوبند کا نام شامل تھا نہ مظاہر علوم سہارنپور کا، نہ اس مزاج ومذاق کے کسی بھی ادارے کا، اس قسم کے اظہارِ خیال سے لوگ کس قسم کی تنگ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں اس پر حیرت ہوتی ہے، خصوصاً اس لیے کہ ان صاحب کا شمار مدارس کے ''کرم فرما'' طبقے میں بھی نہیں ہوتا۔

یہاں پر یہ بات بھی مناسبت کی بنیاد پر آ گئی ورنہ اصل مخاطب تو وہی طبقہ ہے جو اپنے خیال میں اصلاح کی بات کرتا ہے، لیکن اس کا طرزِ عمل اس مقصد سے میل نہیں کھاتا۔

ان تمام ہی حضرات سے بڑی دل سوزی کے ساتھ عرض ہے کہ اس وقت اس بے سہارا ملت کی اہم اور مرکزی طاقت یہ مدارس ہی ہیں، خدارا ان کو کمزور کرنے کی کوشش کرکے ان طاقتوں کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ نہ بنیں جو عالمی سطح پر دینی تعلیم کے نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے یا اس کا قبلہ بدلنے کے لیے اپنے تمام وسائل کے ساتھ سرگرم ہیں اور جو سیاست ومعیشت کے میدانوں میں اپنے مقاصد کی تکمیل کرنے کے بعد اب مسلمانوں کے خرمن دین وایمان کو خاکستر کرنے کے لیے بگولے اٹھا رہی ہیں۔ ع

کہ یہ دھبہ بھی کیوں باقی رہے صحرا کے دامن پر

اہل سنت و جماعت کی بارہ اہم علامتیں

(وصایا امام اعظم امام ابوحنیفہؒ سے)

ترجمہ: مدثر جمال تونسوی
اُستاذ الحدیث جامعہ الصابر، بھاول پور

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ (متوفی ۱۵۰ھ) کی مختلف وصیتیں ہیں جو ان کے مختلف شاگردوں سے منقول ہیں، اس وقت جس وصیت کا ترجمہ پیش کرنا مقصود ہے، یہ وصیت عقائد کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے اور یہ وصیت امام صاحب کے نامور شاگرد امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ (متوفی ۱۸۲ھ) کی روایت سے نقل ہوئی ہے۔ اس میں امام صاحب نے اہل السنۃ والجماعۃ کی بارہ علامات بیان فرمائی ہیں، اگرچہ مزید غور سے دیکھا جائے تو ہر علامت متعدد مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے عقائد کے یہ مضامین بارہ سے زیادہ بن جاتے ہیں؛ مگر ہم نے امام صاحب کے بیان کے موافق ان علامات کو بارہ کے عدد سے ہی ذکر کیا ہے اور جس قدر مضمون ایک علامت کے تحت امام صاحب کی اس وصیت میں درج ہے ہم نے بھی اسی طرح اس کو باقی رکھا ہے۔

اس وصیت کی ایک معروف شرح مصر کے معروف حنفی فقیہ و اصولی علامہ اکمل الدین محمد بن محمد البابرتی حنفی (متوفی ۷۸۶ھ) نے تحریر کی ہے، جسے عصر حاضر میں الدکتور محمد صبحی عایدی اور الدکتور حمزہ محمد وسیم البکری نے تحقیق وتخریج اور تعلیق کے ساتھ شائع کیا ہے، اور یہ نسخہ دار الفتح، اردن سے شائع ہوا ہے۔

اسی شرح کے آغاز سے قارئین کی سہولت کے لیے وصیت کا متن الگ سے بھی شامل کیا گیا ہے، بندہ ناچیز نے اسی متن کو سامنے رکھ کر اس کا عام فہم ترجمہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل سے قبول فرمائیں۔

آغاز ترجمہ: میرے دوستو اور میرے بھائیو! جان لو کہ اہل السنۃ والجماعۃ کی بارہ علامتیں ہیں، جو ان پر استقامت کے ساتھ قائم رہے گا وہ نہ تو بدعتی شمار ہوگا اور نہ ہی خواہش پرست۔ لہٰذا تم ان بارہ باتوں پر مضبوطی سے قائم رہو؛ تاکہ سیدنا محمد علیہ الصلاۃ والسلام کی شفاعت کے حق دار بن سکو۔

پہلی علامت: ایمان زبان سے اقرار کرنے اور دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے، فقط زبانی اقرار، ایمان نہیں ہے؛ کیونکہ اگر یہ ایمان ہوتا تو منافق سارے کے سارے مومن ہوتے۔

اسی طرح محض معرفت اور پہچان بھی ایمان نہیں ہے؛ کیوں کہ اگر یہ ایمان ہوتی، تو اہلِ کتاب سب کے سب مومن ہوتے۔

اللہ تعالی نے منافقوں کے بارے میں فرمایا ہے: **وَاللّٰہُ یَشْھَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ لَکَاذِبُونَ**۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹ بول رہے ہیں۔ (سورۃ المنافقون)

اور اللہ تعالی نے اہلِ کتاب کے بارے میں فرمایا ہے: وہ لوگ کہ جنھیں ہم نے (پہلے) کتاب دی ہے وہ انھیں (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۴۶)

ایمان نہ تو زیادہ ہوتا ہے اور نہ ہی کم؛ کیوں کہ ایمان کی کمی تب ہی تصور میں آسکتی ہے جب کہ کفر میں اضافہ مانا جائے اور اسی طرح ایمان میں اضافہ تبھی مانا جا سکتا؛ جب کہ کفر میں کمی مانی جائے اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک ہی بندہ ایک ہی حالت میں مومن بھی ہو اور کافر بھی؟

اور جو مومن ہوتا ہے وہ پکا مومن ہوتا ہے اور جو کافر ہوتا ہے وہ پکا کافر ہوتا ہے۔ ایمان میں شک کی گنجائش نہیں ہوتی؛ جیسا کہ کفر میں شک کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **أُولٰئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقّاً** (سورۃ الانفال: ۴) یہی لوگ سچے مومن ہیں۔

اور فرمایا: **أُولٰئِکَ ھُمُ الْکَافِرُونَ حَقّاً** (سورۃ النساء: ۱۵۱) یہی لوگ کافر ہیں پکے۔

اور ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے جو گناہ گار افراد ہیں وہ سب کے سب مومن ہیں، کافر نہیں ہیں۔

اور عمل، ایمان دونوں الگ الگ حقیقت ہیں، دلیل یہ ہے کہ بہت سے ایسے مواقع میں جب مومن بندے سے عمل معاف ہوجاتا ہے اس وقت یہ کہنا درست نہیں ہوتا کہ اس سے ایمان معاف ہوگیا ہے؛ چنانچہ حیض والی عورت کو اللہ سبحانہ وتعالی نے نماز معاف کی ہے، اب اس موقع پر یوں کہنا جائز نہیں ہے کہ اس سے ایمان معاف ہوگیا ہے اور اسے حیض کی حالت میں ایمان چھوڑنے کا حکم ہے۔

اسی طرح حیض والی عورت سے شارع نے یہ تو کہا ہے کہ روزے چھوڑ دو، پھر بعد میں ان کی قضا کرنا؛ مگر اس موقع پر یوں کہنا درست نہیں ہے کہ ایمان چھوڑ دو، پھر ایمان کی قضا کرلینا، اسی طرح یوں کہنا تو درست ہے کہ فقیر پر زکوۃ فرض نہیں ہے؛ مگر یوں کہنا درست نہیں ہے کہ فقیر پر ایمان فرض نہیں۔

اور ہر اچھی اور بُری تقدیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے؛ چنانچہ اگر کوئی یہ گمان رکھتا ہو کہ اچھائی یا بُرائی کی تقدیر اللہ تعالی کے علاوہ کسی اور سے ہوتی ہے تو وہ اللہ تعالی کے ساتھ کفر کرنے والا ہوگا اور اس کی توحید بے کار ہوگی۔

دوسری علامت: ہم اِقرار کرتے ہیں کہ اعمال تین قسم کے ہیں:

فرض فضیلت معصیت

فرض: اللہ تعالی کے حکم، اس کی مشیت، اس کی محبت، اس کی رضا، اس کی قضا، اس کی تقدیر، اس کی تخلیق، اس کے حکم، اس کے علم، اس کی توفیق سے ہوتا ہے اور لوح محفوظ میں اس کی طرف سے لکھا ہوا ہوتا ہے۔

جب کہ **فضیلت** میں اللہ تعالی کا امر شامل نہیں ہوتا؛ البتہ اس کی مشیت، اس کی محبت، اس کی رضا، اس کی قضا، اس کی تقدیر، اس کا حکم، اس کا علم، اس کی توفیق وتخلیق سے ہوتا ہے اور یہ بھی اس کی طرف سے لوحِ محفوظ میں لکھا ہوتا ہے۔

اور **معصیت** میں اللہ تعالی کا امر نہیں ہوتا اور مشیت ہوتی ہے؛ لیکن محبت نہیں ہوتی،

اس کی قضا ہوتی ہے؛ لیکن رضا نہیں ہوتی، اس کی تقدیر ہوتی ہے؛ لیکن اس کی توفیق نہیں ہوتی؛ بلکہ یہ اس کی طرف سے (گناہ کرنے والے کے لیے) رسوائی ہوتی ہے، ہاں یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ضرور ہوتی ہے اور لوح محفوظ میں بھی لکھی ہوئی ہوتی ہے۔

تیسری علامت: ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا؛ مگر نہ تو وہ عرش کا محتاج ہے اور نہ ہی اس پر قرار پکڑے ہوئے ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عرش ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور مخلوق وہی بغیر کسی محتاجی کے اپنے اوپر لیے ہوئے ہے؛ کیوں کہ اگر وہ محتاج ہوتا تو کائنات کو وجود دینے اور اس میں تدبیر کرنے کی قدرت نہ رکھتا جیسا کہ مخلوق (بوجہ محتاج ہونے کے) ان باتوں پر قدرت نہیں رکھتی۔ اسی طرح اگر وہ بیٹھنے اور ٹھکانہ پکڑنے کا محتاج ہوتا تو وہ سوال یہ ہے کہ وہ عرش کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں (بیٹھا ہوا) تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس (بات یعنی محتاج ہونے، بیٹھنے اور ٹھکانہ پکڑنے) سے پاک اور بلند شان والے ہیں۔

چوتھی علامت: ہم اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، مخلوق نہیں ہے۔ اسی نے اس کی وحی کی ہے اور اسی نے اِسے اُتارا ہے؛ یہ نہ تو عین اس کی ذات ہے اور نہ ہی اس کا غیر ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اُس کی صفت ہے۔

یہ قرآن مصاحف میں لکھا ہوا ہے، زبان سے پڑھا جاتا ہے، سینوں میں محفوظ ہوتا ہے؛ مگر اِن چیزوں میں اُتر کر ان کا جزو (اور ان چیزوں کی صفت) نہیں بن جاتا اور یہ روشنائی، کاغذ اور کتابت سب کی سب چیزیں مخلوق ہیں؛ کیوں کہ یہ سب چیزیں بندوں کا فعل ہیں، اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام مخلوق نہیں ہے؛ کیوں کہ کتابت اور حروف اور کلمات وآیات قرآن کریم کی نشاندہی کرتے ہیں کیوں کہ بندے ان کے محتاج ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے؛ البتہ اس کلام کا مفہوم اور معنی ومطلب انھیں چیزوں کے ذریعے سمجھ میں آتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام مخلوق ہے، وہ اللہ کے ساتھ کفر کر رہا ہے،

اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے معبود ہے، اس کا کلام بے شک پڑھا بھی جاتا ہے، لکھا بھی جاتا ہے اور یاد بھی کیا جاتا ہے؛ مگر اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے جُدا اور الگ نہیں ہوتا۔

پانچویں علامت: ہم اس بات کا اِقرار کرتے ہیں کہ اس امت میں ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل سیدنا ابوبکر صدیق، ان کے بعد سیدنا عمر، ان کے بعد سیدنا عثمان اور ان کے بعد سیدنا علی، رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا درج ذیل فرمان اس کی بنیاد ہے: وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ، أُولٰئِکَ الْمُقَرَّبُونَ، فِیْ جَنَّاتِ النَّعِیْمِ (سورۃ الواقعہ: ۱۰-۱۲)

چنانچہ جو بھی سب سے آگے ہے وہ اسی حساب سے سب سے افضل ہے۔

ان حضرات سے ہر وہ شخص جو مومن اور متقی ہے محبت رکھتا ہے اور جو منافق اور بدبخت ہے وہ اِن سے بغض رکھتا ہے۔

چھٹی علامت: ہم اس کا بات کا اِقرار کرتے ہیں کہ انسان اپنے اعمال، اپنے اِقرار اور اپنی معرفت سمیت مخلوق ہے؛ کیوں کہ جب ان کاموں کا فاعل (یعنی انسان) مخلوق ہے تو اس کے اَفعال بدرجۂ اَولیٰ مخلوق ہوئے۔

ساتویں علامت: ہم اس بات کا اِقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہی مخلوق کو پیدا کیا ہے، مخلوق کی اپنی کوئی طاقت نہیں تھی؛ کیوں کہ مخلوق تو نِری عاجز اور کمزور ہے اور اللہ تعالیٰ ہی ان کا خالق اور ان کا رازق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا درج ذیل فرمان اس کی دلیل ہے: اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ (سورۃ الروم: ۴۰) اللہ ہی وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہیں رزق دیتا ہے، پھر تمہیں موت دے گا اور پھر تمہیں زندہ کرے گا۔

کمائی کرنا حلال ہے اور حلال مال سے مال جمع کرنا بھی حلال ہے؛ البتہ حرام مال سے مال جمع کرنا حرام ہے۔

لوگ تین قسم کے ہیں:

ایک وہ مومن جو اپنے ایمان میں مخلص ہے۔

دوسرا وہ کافر جو اپنے انکار اور ضد میں اپنے کفر پر اڑا ہوا ہے۔

تیسرا وہ جو منافق اور اپنے نفاق میں مداہن (دوسروں کو دھوکے میں رکھنے والا) ہے۔

اب اللہ تعالی نے مخلص مومن پر عمل کرنا، کافر پر ایمان لانا اور منافق پر اخلاص اختیار کرنا فرض فرمایا ہے۔

اللہ تعالی کا درج ذیل فرمان میں یہی اشارہ ہے: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ** (النساء: ۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو!

مطلب اس کا یہ ہیکہ اے ایمان والو! تم فرماں برداری والے اعمال بجالاؤ! اے کافرو! تم ایمان لے آؤ! اور اے منافقو! تم مخلص بن جاؤ!

آٹھویں علامت: ہم اس بات کا اِقرار کرتے ہیں کہ استطاعت فعل کے ساتھ وجود پذیر ہوتی ہے۔ استطاعت نہ تو فعل سے پہلے ہوتی ہے اور نہ ہی فعل کے بعد؛ کیوں کہ اگر فعل سے پہلے ہو تو بندہ ضرورت کے وقت اللہ تعالی سے بے نیاز قرار پایا اور یہ بات نص قرآنی کے خلاف ہے: **وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاء** (سورۃ محمد: ۳۸) اور اللہ ہی بے نیاز ہے جب کہ تم تو محتاج ہو۔

اور اگر استطاعت فعل کے بعد ہو تو یہ ناممکنات میں سے ہے؛ کیوں کہ اس طرح لازم آئے گا کہ وہ فعل استطاعت اور طاقت کے بغیر وجود پذیر ہوا ہے۔

نویں علامت: ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا (شرعا) ثابت ہے، مقیم کے لیے ایک دن رات اور مسافر کے لیے تین دن رات؛ کیوں کہ حدیث میں اسی طرح وارد ہوا ہے اور جو شخص اس کا انکار کرتا ہو اس پر کفر کا خوف ہے؛ کیوں کہ یہ حدیث خبر متواتر کے قریب قریب ہے۔

اور سفر میں روزے کی رخصت اور نماز کا قصر بھی نص قرآنی سے ثابت ہے، اللہ تعالی کا

ارشاد ہے :وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ الأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُواْ مِنَ الصَّلٰوةِ(سورة النساء: ۱۰۱) اور جب تم زمین پر سفر کروتوتم پر کوئی حرج نہیں ہوگا کہ تم نماز یں قصر کرلو۔

اور روزے کی رخصت کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے :فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيْضاً أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (سورة البقرة:۱۸۴) چنانچہ تم میں سے جو شخص بیمار یا سفر پر ہوتو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پورے کرلے!

دسویں علامت: ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالی نے قلم کو لکھنے کا حکم دیا،توقلم نے پوچھا :اے میرے رب! میں کیا چیز لکھوں؟ تو اللہ تعالی نے فرمایا: تو وہ سب لکھ دے جو قیامت تک ہونے والا ہے، اس کی دلیل اللہ تعالی کا درج ذیل فرمان ہے :وَ كُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِيْ الزُّبُرِ وَ كُلُّ صَغِيْرٍ وَ كَبِيْرٍ مُسْتَطَرٌ (سورةالقمر:۵۳-۵۲)اور ہر وہ چیز جوانہوں نے کی وہ صحیفوں میں ہےاور ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی ہوئی ہے۔

گیارہوں علامت: ہم اس بات کا اِقرار کرتے ہیں کہ عذاب قبر بھی یقینا ہونے والا ہے اور منکر ونکیر کا سوال بھی برحق ہے اور اس کی بنیاد احادیث نبویہ ہیں۔

اور جنت وجہنم بھی برحق ہیں اور وہ دونوں اپنے اپنے لوگوں کے لیے پیدا ہو چکی ہیں؛ چنانچہ ایمان والوں کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے :أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (سورة آل عمران:۱۳۳) (وہ جنت) متقی لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

اور کافروں کے بارے میں فرمان ہے :أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ (سورة البقرة:۲۴، آل عمران: ۱۳۱) (وہ جہنم) کافروں کے لیے تیار کی جا چکی ہے۔اللہ تعالی نے ان جگہوں کو ثواب اور عقاب کے لیے پیدا کیا ہے۔

اور اعمال نامہ (تُلنے کا ترازو) بھی برحق ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے :وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ (سورة الانبياء:۴۷) اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھیں گے۔

اوراعمال ناموں کا پڑھا جانا بھی برحق ہے۔اللہ تعالیٰ کا درج ذیل فرمان اس کی دلیل ہے:

اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْباً (سورۃ الاسراء:۱۴) (قیامت کے دن بندے سے کہا جائے گا) تو اپنا اعمال نامہ پڑھ، آج یہ اعمال نامہ ہی تیرے بارے میں حساب بتانے کے لیے کافی ہے۔

بارہویں علامت: ہم اس بات کا اِقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالی ان انسانوں کو جزاو ثواب اور ادائے حقوق کے لیے موت کے بعد زندہ کریں گے اور انھیں ایسے دن میں اُٹھائیں گے جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہوگی۔اس کی دلیل اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے: وَأَنَّ اللهَ يَبْعَثُ مَن فِيْ الْقُبُورِ (سورۃ الحج:۷) اللہ تعالی زندہ کر اُٹھائیں گے قبر والوں کو۔

اور اہلِ جنت کی اللہ تعالی سے ملاقات برحق ہے اور یہ ملاقات کیفیت، تشبیہ اور جہت سے پاک ہوگی۔(یعنی اللہ تعالی کی نہ تو کوئی کیفیت ہے، نہ کسی کے ساتھ مشابہت ہے اور نہ ہی اللہ تعالی کسی جہت میں ہیں)۔

اور ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت برحق ہے اور یہ ہر اُس شخص کے لیے ہوگی جو اہلِ جنت میں سے ہے اگرچہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو۔

اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالی عنہا کے بعد تمام عورتوں سے افضل سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا ہیں اور وہ زنا کی تہمت سے اور روافض جو نقائص کی اُن کی طرف منسوب کرتے ہیں، اُن سب سے پاک ہیں؛ بلکہ جو شخص ان پر زنا کی تہمت لگاتا ہے وہ خود زنا کی پیداوار ہے۔

اور اہل جنت جنت میں ہمیشہ رہیں گے؛ جب کہ اہل جہنم جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔اس کی دلیل اللہ تعالی کے درج ذیل فرامین ہیں، اہل جنت کے بارے میں ارشاد ہے: أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُونَ (البقرۃ:۸۲) یہ جنتی ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اور کفار کے بارے میں ارشاد ہے: أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُونَ (البقرۃ:۳۹) یہ دوزخ والے ہیں جو اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔

شرعی پردے کی حقیقت

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

اسلام نے خواتین کو عزت وحرمت کا جو مقام بخشا ہے، اور اس کے تقدس کی حفاظت کے لئے جو تعلیمات دی ہیں، وہ دنیا بھر کے مذاہب اور اقوام میں ایک منفرد حیثیت کی حامل ہیں، اسلام نے ایک طرف عورت کی حرمت اور دوسری طرف اس کے جائز تمدنی اور معاشرتی حقوق کا تحفظ کرنے کے لئے جو احکام عطا فرمائے ہیں ان کی حکمتوں کا احاطہ انسانی عقل کے ادراک سے بالاتر ہے، مسلمان عورت اسی عزت کے تحفظ کے ساتھ تمام ضروری تمدنی حقوق رکھنے کے باوجود تلاشِ معاش میں ماری ماری پھرنے کے لئے نہیں، بلکہ گھر کی ملکہ بننے کے لئے پیدا ہوئی ہے، اسی لئے شریعت نے اس کی عمر کے کسی مرحلے میں فکر معاش کا بوجھ اس کی گردن پر نہیں ڈالا، خال خال صورتیں تو مستثنیٰ ہیں، لیکن عام حالات میں شادی سے پہلے اس کے معاش کی ذمہ داری باپ پر اور شادی کے بعد شوہر یا اولاد پر ڈالی گئی ہے، لہٰذا ناگزیر ضرورتوں کو چھوڑ کر، عام طور پر اسے معاش کے لئے سڑکیں چھاننے کی ضرورت نہیں۔

چنانچہ اس کی عزت وآبرو اور اس کی حرمت وتقدس کو سلامت رکھنے کے لئے حکم یہ دیا گیا ہے کہ ”اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو، اور پچھلی جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار کر کے باہر نہ پھرا کرو“۔

ضرورت کے موقع پر عورت کو گھر سے باہر جانے کی اجازت بھی اسلام نے دی ہے، لیکن اس طرح کہ وہ پردے کے آداب وشرائط کو ملحوظ رکھ کر بقدر ضرورت باہر نکلے، اور اپنے آپ کو ہوسناک نگاہوں کا نشانہ بننے سے بچائے، اس غرض کے لئے مرد وعورت کے درمیان فطری تقسیم کار یہ رکھی گئی ہے کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے۔

مرد کے لئے کما کر لانا عورت پر اس کا کوئی احسان نہیں، اس کا لازمی فریضہ ہے،

بلکہ اس معاملے میں اسلام نے عورت کو یہ فضیلت اور امتیاز بخشا ہے کہ گھر کا انتظام بھی قانونی طور پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے، اخلاقی طور پر اس کو اس بات کی ترغیب ضرور دی گئی ہے کہ وہ شوہر کے گھر کی دیکھ بھال کرے، لیکن اگر کوئی عورت اپنی اس اخلاقی ذمہ داری کو پورا نہ کرے تو مرد اس کو بزورِ قانون اس پر مجبور نہیں کرسکتا۔

اس کے برخلاف مرد پر عورت کے لئے کمانے کی ذمہ داری اخلاقی بھی ہے اور قانونی بھی، اگر کوئی مرد اس میں کوتاہی کرے تو عورت بزورِ قانون اسے اس ذمہ داری کی ادائیگی پر مجبور کرسکتی ہے۔

اسلام نے عورت کو یہ امتیاز اس لئے عطا فرمایا ہے تا کہ وہ کسبِ معاش کی الجھنوں میں پڑ کر معاشرتی برائیوں کا سبب بننے کے بجائے گھر میں رہ کر قوم کی تعمیر کی خدمت انجام دے، گھر کا ماحول معاشرہ کی وہ بنیاد ہے جس پر تمدن کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے، اگر یہ بنیاد خراب ہو تو اس کا فساد پورے معاشرے میں سرایت کر جاتا ہے، اس کے برعکس اگر ایک مسلمان خاتون اپنے گھر کے ماحول کو سنوار کر ان نونہالوں کی صحیح تربیت کرے جنھیں آگے چل کر قوم وملک کا بوجھ اٹھانا ہے تو ساری قوم خود کار طریقے پر سنور سکتی ہے اور اس طرح مرد وعورت کی عزت وآبرو کا پورا تحفظ ہوتا ہے، دوسری طرف ایک ایسا صاف ستھرا گھریلو نظام وجود میں آتا ہے جو آل کار پورے معاشرے کی پاکیزگی کا ضامن بن سکتا ہے۔

لیکن جس ماحول میں معاشرے کی پاکیزگی کوئی قیمت ہی نہ رکھتی ہو، اور جہاں عفت وعصمت کے بجائے اخلاق باختگی اور حیا سوزی کو منتہائے مقصود سمجھا جاتا ہو، ظاہر ہے کہ وہاں اس تقسیم کار اور پردہ وحیا کو نہ صرف غیر ضروری بلکہ راستے کی رکاوٹ سمجھا جائے گا۔

چنانچہ جب مغرب میں تمام اخلاقی اقدار سے آزادی کی ہوا چلی تو مرد نے عورت کے گھر میں رہنے کو اپنے لئے دوہری مصیبت سمجھا، ایک طرف تو اس کی ہوسناک طبیعت عورت کی کوئی ذمہ داری قبول کئے بغیر قدم قدم پر اس سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی، اور دوسری طرف وہ اپنی

قانونی بیوی کی معاشی کفالت کو بھی ایک بوجھ تصور کرتا تھا، چنانچہ اس نے دونوں مشکلات کا جو عیارانہ حل نکالا اس کا خوبصورت اور معصوم نام ''تحریک آزادئ نسواں'' رکھا، عورت کو یہ پڑھایا گیا کہ تم اب تک گھر کی چار دیواری میں قید رہی ہو، اب آزادی کا دور ہے، اور تمہیں اسی قید سے باہر آ کر زندگی کے ہر کام میں حصہ لینا چاہئے، اب تک تمہیں حکومت وسیاست کے ایوانوں سے بھی محروم رکھا گیا ہے، اب تم باہر آ کر زندگی کی جدو جہد میں برابر کا حصہ لو تو دنیا بھر کے اعزازات اور اونچے اونچے منصب تمہارا انتظار کر رہے ہیں، عورت بیچاری ان دلفریب نعروں سے متاثر ہو کر گھر سے باہر آ گئی، اور پروپیگنڈے کے تمام وسائل کے ذریعے شور مچا مچا کر اسے یہ باور کرایا گیا کہ اسے صدیوں کی غلامی کے بعد آج آزادی ملی ہے، اور اب اس کے رنج ومحن کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

ان دلفریب نعروں کی آڑ میں عورت کو گھسیٹ کر سڑکوں پر لایا گیا، اسے دفتروں میں کلرکی عطا کی گئی، اسے اجنبی مردوں کے پرائیویٹ سیکریٹری کا ''منصب'' بخشا گیا، اسے ''اسٹینوٹائپسٹ'' بننے کا ''اعزاز'' دیا گیا، اسے سینکڑوں انسانوں کی حکم برداری کے لئے ''ائیر ہوسٹس'' کا ''عہدہ'' عنایت کیا گیا، اسے تجارت چمکانے کے لئے ''سیلز گرل'' اور ''ماڈل گرل'' بننے کا شرف بخشا گیا اور اس کے ایک ایک عضو کو برسر بازار رسوا کر کے گاہکوں کو دعوت دی گئی کہ آؤ، اور ہم سے مال خریدو، یہاں تک کہ وہ عورت جس کے سر پر دین فطرت نے عزت وآبرو کا تاج رکھا تھا، اور جس کے گلے میں عفت وعصمت کے ہار ڈالے تھے، تجارتی اداروں کے لئے ایک تفریح کا سامان بن کر رہ گئی، نام یہ لیا گیا تھا کہ عورت کو ''آزادی'' دے کر سیاست وحکومت کے ایوان اس کے لئے کھولے جا رہے ہیں، لیکن ذرا جائزہ لے کر تو دیکھئے کہ اس عرصے میں خود مغربی ممالک کی کتنی عورتیں صدر، وزیر اعظم یا وزیر بن گئیں؟ کتنی خواتین کو جج بنایا گیا؟ کتنی عورتوں کو دوسرے بلند مناصب کا اعزاز نصیب ہوا؟ اعداد وشمار جمع کئے جائیں تو ایسی عورتوں کا تناسب بمشکل چند فی لاکھ ہوگا، ان گنی چنی خواتین کو کچھ مناصب دینے کے نام پر باقی لاکھوں عورتوں کو جس بے دردی کے ساتھ سڑکوں اور بازاروں میں گھسیٹ لایا گیا ہے وہ ''آزادئ نسواں'' کے فراڈ کا المناک ترین پہلو ہے۔

پروپیگنڈے کی قوتوں نے یہ عجیب وغریب فلسفہ ذہنوں پر مسلط کردیا ہے کہ عورت اگر اپنے گھر میں اپنے اور اپنے شوہر، اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور اولاد کے لئے خانہ داری کا انتظام کرے تو یہ قید اور ذلت ہے لیکن وہی عورت اجنبی مردوں کے لئے کھانے پکائے، ان کے کمروں کی صفائی کرے، ہوٹلوں اور جہازوں میں ان کی میزبانی کرے، دکانوں پر اپنی مسکراہٹوں سے گاہکوں کو متوجہ کرے، اور دفاتر میں اپنے افسروں کی ناز برداری کرے تو یہ آزادی اور اعزاز ہے، پھر ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ عورت کسب معاشرہ کے لئے آٹھ گھنٹے کی یہ سخت اور ذلت آمیز ڈیوٹیاں ادا کرنے کے باوجود اپنے گھر کے کام دھندوں سے اب بھی فارغ نہیں ہوئی، گھر کی تمام خدمات آج بھی پہلے کی طرح اسی کے ذمے ہیں، یورپ اور امریکہ میں اکثریت ان عورتوں کی ہے جن کو آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی دینے کے بعد اپنے گھر پہنچ کر کھانے پکانے، برتن دھونے اور گھر کی صفائی کا کام اب بھی کرنا پڑتا ہے۔

یہ مغربی ممالک کے وہ ناقابل انکار حالات ہیں جن کا ہر شخص وہاں جا کر مشاہدہ کرسکتا ہے اور جو لوگ وہاں نہیں جاسکے، ان حالات کی خبریں لازماً ان تک بھی پہنچتی رہتی ہیں، تقلید مغرب کے جو شائقین شروع شروع وہاں جا کر آباد ہوئے، کچھ عرصے تک وہاں کی چمک دمک کی سیر کرنے کے بعد جب خود صاحبِ اولاد ہوئے اور اپنی بچیوں کا مسئلہ سامنے آیا تو ان کی پریشانی اور بے چینی کا یہاں رہ کر اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

سوال یہ ہے کہ کیا کوئی مسلمان (جس کے دل میں ایمان کی کوئی رمق موجود ہو) یہ پسند کرسکتا ہے کہ خدانخواستہ یہ گھناؤنے حالات ہمارے اپنے ملک اور اپنے معاشرے میں بھی دہرائے جائیں؟ اگر نہیں، یقیناً نہیں، تو یہ کیا ستم ہے کہ ہم بھی رفتہ رفتہ بے پردگی اور بے حجابی کے اسی راستے چل رہے ہیں جس نے مغرب کو معاشرتی تباہی اور اخلاقی دیوالیہ پن کے آخری سرے تک پہنچا دیا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ مسلمان خاندان کی خواتین کی سواریوں پر بھی پردے بندھے ہوئے تھے، اور پردہ شرافت اور عالی نسبی کا نشان سمجھا جاتا تھا، لیکن آج انہی شریف گھرانوں کی بیٹیاں بازاروں

میں برہنہ سر گھوم رہی ہیں، بڑے شہروں میں تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ شہر میں برقع کی شکل خال خال ہی کہیں نظر آتی ہے، بے پردگی کے سیلاب نے حیاء وغیرہ تک کا جنازہ نکال کر رکھ دیا ہے، اور دیندار گھرانوں میں بھی پردے کی اہمیت کا احساس روز بروز گھٹ رہا ہے۔

بعض لوگ بے پرگی کی حمایت میں یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ہماری بے پردگی کو یورپ، اور امریکہ کی بے پردگی پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اور یہاں کی بے پردگی وہ نتائج پیدا نہیں کرے گی جو مغرب میں پیدا ہو چکے ہیں۔

لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ جو کچھ مغرب میں ہوا یا ہو رہا ہے وہ فطرت کے ساتھ بغاوت کے لازمی اور منطقی نتائج ہیں، یہ بغاوت جہاں کہیں ہوگی، اپنے انہی منطقی نتائج تک پہنچ کر رہے گی، ان نتائج کو کھوکھلے فلسفوں سے نہیں روکا جاسکتا۔

جو لوگ بے پردگی کو فروغ دینے کے بعد معاشرے میں عفت وعصمت باقی رکھنے کے دعوے کرتے ہیں، یا تو خود احمقوں کی جنت میں بستے ہیں، یا دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں۔

واقعات اس بات کے گواہ ہیں کہ جب سے ہمارے معاشرے میں بے پردگی کا رواج بڑھا ہے اس وقت سے اغواء، زنا اور دوسرے جرائم کی شرح کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے اور اس طرح جس مقدار میں ہم بے پردگی کی طرف بڑھے ہیں، اسی تناسب سے مغربی معاشرے کی لعنتیں بھی ہمارے یہاں سرایت کر گئی ہیں۔

ان لعنتوں کے سد باب کا اگر کوئی راستہ ہے تو صرف یہ کہ ہم پردے کے سلسلے میں اپنے طرز عمل کو بدل کر دین فطرت کی انہی تعلیمات کی طرف لوٹیں جنہوں نے ہمیں پاکیزہ زندگی گذارنے کا طریقہ سکھایا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ پروپیگنڈے اور خراب ماحول کے زیر اثر رفتہ رفتہ بے پردگی کی برائی ذہنوں سے محو ہوتی جا رہی ہے، اور جن گھرانوں کے بارے میں کبھی بے پردگی کا تصور بھی نہیں

آسکتا تھا اب وہاں بھی پردہ ختم ہورہا ہے، گھر کے وہ بڑے جو بذاتِ خود بے پردگی کو برا سمجھتے ہیں وہ بھی رفتہ رفتہ اس سیلاب کے آگے سپر ڈال رہے ہیں، اور ہمارے نزدیک اس سیلاب کی تیز رفتاری کا بڑا سبب یہی ہے، اگر یہ لوگ سپر ڈالنے کے بجائے اپنے گھر والوں کا ذہن بنانے کی فکر کریں، انہیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام یاد دلائیں، ان احکام کی نافرمانی کے سنگین نتائج سے آگاہ کریں اور انہیں یہ باور کرادیں کہ وہ اپنی موجودگی میں اپنے گھر کی خواتین کو بے پردہ نہیں دیکھیں گے تو ان شاء اللہ اس سیلاب پر روک ضرور قائم ہوگی۔

ہمارے خطباء اور واعظ حضرات نے بھی ایک مدت سے اس مسئلہ کی وضاحت چھوڑ رکھی ہے، اور اس اسلامی حکم کی تعلیم وتبلیغ میں بھی بہت سستی آ گئی ہے، شاید یہ خیال ہونے لگا ہے کہ اس معاملہ میں وہ وعظ ونصیحت بے اثر ہوچکی ہے لیکن خوب سمجھ لینا چاہئے داعیٔ حق کا کام یہ ہے کہ وہ تھکنے اور مایوس ہونے کے بجائے اپنے حصے کا کام انجام دیتا رہے، نتائج تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، لیکن داعی کا کام یہ ہے کہ وہ دعوت کو سست نہ پڑنے دے، تجربہ اس بات کا گواہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ جو بات کہی جاتی ہے وہ ایک نہ ایک دن اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے۔ یہ قرآن کریم کا وعدہ ہے ''اور نصیحت کرو، کہ بلاشبہ نصیحت مؤمنوں کو فائدہ پہنچاتی ہے''۔

حالات بلاشبہ تشویشناک ہیں، لیکن بفضلہ تعالیٰ ابھی ہمارا معاشرہ اس مقام پر نہیں پہنچا جہاں اصلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہتی، ہزار غفلتوں اور کوتاہیوں کے باوجود بحمداللہ ابھی دلوں میں اللہ تعالیٰ پر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر اور یومِ آخرت پر ایمان موجود ہے، اور اس دولتِ ایمان کی وجہ سے ابھی دعوت وتبلیغ کے لئے لوگوں کے کان بالکل بند نہیں ہوئے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اخلاص اور حکمت کے ساتھ موثر انداز میں حق کی دعوت متواتر پہنچتی رہے، اگر خدانخواستہ اس مرحلے پر اس فریضہ میں کوتاہی جاری رہی تو اصلاح کی کوششیں روز بروز مشکل تر ہوتی جائیں گی، اور خدانہ کرے کہ ہمارے معاشرے میں وہ صورت حال پیدا ہو جس سے آج مغربی ممالک دوچار ہیں۔ ✡✡✡✡✡✡

گذشتہ سے پیوستہ

دور اندیش اور صاحبِ نظر کون تھا؟

مدارس اسلامیہ کے موجودہ نصاب و نظام تعلیم پر ایک تحریر

مولانا محمد معاویہ سعدی استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

ہر زمانے کے معاصر علوم وفنون (وعلم آدم الأسماء کلها) کے تحت ''آدمیوں'' کی ایک معاشرتی ضرورت ہیں، نہ ان کی اہمیت وافادیت کا انکار کیا جاسکتا ہے، نہ ان کے مطلوب وضروری ہونے کا، اور یہ سلسلہ ہر زمانے میں بغیر کسی شور اور ہنگامے کے جاری بھی رہا ہے، آخر آج سے پہلے بھی طب، معالجہ، تجارت، زراعت، اور دیگر حرفت وصنعت وغیرہ سائنسی اور معاشرتی علوم وفنون پائے جاتے تھے یا نہیں؟ اور کیا کبھی کسی عالم دین نے ان کی ضرورت واہمیت کا انکار کیا ہے؟

مگر پریشانی اس وقت شروع ہوتی ہے جب اس عام معاشرتی ضرورت کے نصاب ونظام کو دینی مدارس کا حریف، یا ان کے نصاب ونظام کا حصہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، حالاں کہ نہ تو یہ علوم وفنون ہمارے مدارس کے حریف ہیں، کہ ان کو مدارس کا مدمقابل بنا کر پیش کیا جائے، جیسا کہ دین بیزار طبقات کرتے ہیں، اور نہ ہی یہ ہمارے نصاب ونظام کا جزو ہیں، جیسا کہ آج کل بعض اپنے حضرات کی تقریر وتحریر سے بھی اس کا اِیہام ہوتا ہے۔

بلکہ یہ عام انسانوں کی عام ضرورتوں سے متعلق فنون ہیں، جو جس فن کو جتنا سیکھنا چاہے (اپنے عقیدہ وعمل کی ضمانت کے ساتھ) سیکھے، اور رہے ہمارے مدارس تو یہ دنیا کی آمیزش کے بغیر ''خالص دینی'' ادارے ہیں، حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مدرسہ دیوبند کی تعلیم کی بابت بڑے بڑے انگریزوں کی یہ تحریر ہے کہ اگر اِس مدرسہ کی مذہبی تعلیم میں دنیاوی تعلیم شامل کی گئی، تو اِس کا مذہبی خالص رنگ باقی نہ رہے گا، جو

اِس مدرسہ کا مایۂ ناز ہے‘‘ (ملفوظات ۱۸/ ۲۳۳)۔

دار العلوم دیو بند کے اولین صدر المدرسین حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ کا ارشاد ہے: ’’اکثر لوگوں کو اس مدرسے کی حالت دیکھ کر خیال ہوگا کہ یہاں علوم معاش کا کچھ انتظام نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مدرسہ اس لیے ہے ہی نہیں، نہ ہم نے دعوی کیا ہے کہ تمام علوم کی تعلیم ہوگی، یہ تو صرف ان کے لیے ہے جن کو فکر آخرت نے دیوانہ بنایا ہے‘‘۔ (حسن العزیز ۲/ ۱۳۹)۔

خلاصہ یہ کہ ایک ہے ’’علمِ نبوت‘‘، اور ایک ہے ’’علمِ آدمیت‘‘، ہمارے اِن مدارس کا اَصل موضوع ’’علمِ نبوت‘‘ ہے، ’’علمِ آدمیت‘‘ نہیں، انبیائے کرام علیہم السلام کا مقصدِ بعثت، اور موضوعِ دعوت، معاشرے میں رائج علوم وفنون حاصل کر کے، ’’تمدنی ترقی‘‘ کی دوڑ میں شامل ہونا نہیں ہوتا، بلکہ جو لوگ پہلے سے اِن اُمور میں مشغول ہوتے ہیں اُن کے اندر، دنیا میں انہماک کم کر کے، تعلق مع اللہ، اور فکرِ آخرت کا جذبہ پیدا کرنا ہوتا ہے، اور ہر چیز میں حلال وحرام کی تفصیل بتلا کر، حدودِ شریعت قائم فرمانا ہوتا ہے۔

علمِ نبوت اور علمِ آدمیت کا یہی وہ فرق ہے جو اِن دونوں حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے، کہ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (أعلمكم بالله أنا)، اور دوسرے موقع پر آپ ہی کا ارشاد ہے: (أنتم أعلم بأمر دنياكم)۔

البتہ جو معاصر علوم وفنون: دین فہمی، اشاعتِ دین، یا دفاعِ دین میں مفید ومعاوِن ہو سکتے ہیں، اُن کو بھی حسبِ مصلحت اور بقدرِ ضرورت اُن چند شرائط کے ساتھ دینی مدارس کے نصاب ونظام کا حصہ بنایا جاسکتا ہے، جو حضرت تھانویؒ نے تعلیمِ انگریزی سے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں ذکر فرمائی ہیں۔

’’رسالۂ ’’تحقیقِ تعلیمِ انگریزی‘‘ میں مفصل جواب لکھا ہے، مختصر یہ ہے کہ انگریزی مثل اور زبانوں کے ایک مباح زبان ہے، مگر تین عوارض سے اس میں خرابی آجاتی ہے:

اول: بعض علوم اس میں ایسے ہیں جو شریعت کے خلاف ہیں، اور علمِ شریعت سے واقفیت

ہوتی نہیں، اِس لیے عقائد خراب ہوجاتے ہیں، جس میں بعض عقائد قریبِ کفر، بلکہ کفر ہیں۔

دوسرے: اگر ایسے علوم کی بھی نوبت نہ آئے، تو اکثر صحبت بددینوں کی رہتی ہے، ان کی بددینی کا اثر اس شخص پر آجاتا ہے، کبھی اعتقاداً، جس کا حکم اوپر معلوم ہوچکا، کبھی عملاً، جس سے نوبت فسق کی آجاتی ہے۔

تیسرے: اگر صحبت بھی خراب نہ ہو، یا وہ مؤثر نہ ہو، تو کم از کم اتنا ضرور ہے کہ یہ نیت رہتی ہے کہ اس کو ذریعۂ معاش بناویں گے، خواہ طریقۂ معاش حلال ہو یا حرام، اور یہ مسئلہ عقلاً ونقلاً ثابت ہے کہ جو مباح: ذریعہ کسی حرام کا بن جائے وہ حرام ہوجاتا ہے۔

پھر ایسا عزم خود معاصیٔ قلب سے ہے، تو اِس صورت میں فسقِ ظاہری کے ساتھ فسقِ باطنی بھی ہے۔

اِن عوارض ثلاثہ کی وجہ سے گاہے کفر و اِلحاد تک، گاہے فسقِ ظاہری تک، گاہے صرف فسقِ باطنی تک، نوبت پہنچ جاتی ہے۔

اگر کوئی اِن عوارض سے مبرا ہو: (۱) یعنی عقائد بھی خراب نہ ہوں، جس کا آسان طریقہ، بلکہ متعین طریقہ یہی ہے کہ علمِ دین حاصل کرکے، یقین کے ساتھ اُس کا اعتقاد رکھے، (۲) اور اَعمال بھی خراب نہ ہوں، (۳) عزم بھی یہ رہے کہ اِس سے وہی معاش حاصل کریں گے جو شرعاً جائز ہوگی، اور پھر اسی کے موافق عمل درآمد بھی کرے:

تو ایسے شخص کے لیے انگریزی مباح اور درست ہے، اور اگر اس سے بڑھ کر یہ قصد ہو کہ اُس کو ذریعۂ خدمتِ دین بناویں گے تو اس کے لیے عبادت ہوگی۔

حاصل یہ کہ انگریزی کبھی حرام ہے، کبھی مباح، کبھی عبادت''۔(امدادالفتاوی ۱۵۶/۶)۔

یہاں ایک اہم سوال یہ کیا جاتا ہے کہ جب یونانی فلسفہ آیا تھا، تو وہ بھی کفریہ عقائد اور اِلحاد ہی پر مشتمل تھا، مگر اِس کے باوجود ہمارے اکابر نے اُس کو حاصل کرکے، مفاسد کو دور کیا، اور پوری بصیرت کے ساتھ حق اور ناحق کو ایک دوسرے سے ممتاز کیا، تو جس طرح سے ہمارے اسلاف نے اُس کو بالکلیہ رد کرنے کے بجائے، مفید ومضر پہلوؤں کو ایک دوسرے سے علاحدہ کیا تھا، اِسی طرح سے اکابر دیوبند

وسہارنپور کو بھی چاہیے تھا کہ سائنس وغیرہ جدید علوم حاصل کرتے، پھر اُس کے حق وباطل میں خط امتیاز کھینچتے، تاکہ قوم دینی حیثیت سے اُن کے مضر پہلوؤں سے بچ جاتی، اور دنیوی فوائد حاصل کرلیتی۔

اِس کے جواب میں چند نکتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے:

اول: فلسفہ وغیرہ علوم خیر القرون کے بعد، مسلمانوں کے ہاں آئے ہیں، اِس لیے اُس زمانے کے کسی بھی عمل کو بطور حجت اور معیارِ حق کے نہیں پیش کیا جاسکتا۔

دوم: دوسری بات یہ ہے کہ جب اسلامی معاشرے میں یہ علوم آئے تھے، تو عقائد ہی کی حفاظت کے نقطۂ نظر سے اُس وقت کے بھی دینی حلقوں کی طرف سے ان کی شدید مخالفت کی گئی تھی، پھر یہ علوم معاشرتی ضرورتوں کے تحت اگرچہ مسلمانوں میں داخل ہوتے چلے گئے تھے، مگر جو لوگ اِس میں منہمک ہوئے، وہ عام طور پر اپنے عقائد کی حفاظت نہ کرسکے، چنانچہ بوعلی سینا، فارابی، کندی، زہراوی وغیرہ جتنے مسلمان سائنس دانوں کے نام لیے جاتے ہیں اُن کی شخصیات دینی لحاظ سے کافی مطعون رہی ہیں۔

سوم: تیسری اہم بات یہ ہے کہ اُس وقت مسلمان عروج پر تھے، اور دوسروں سے متاثر ہونے کے بجائے، خود مؤثر اور اثر انداز تھے، اسلامی تہذیب ومعاشرت پوری دنیا کے لیے نمونہ تھی، تو اگر وہ دوسروں کی چیز استعمال کر بھی رہے تھے، تو مرعوب ہوکر نہیں، صرف معاشرتی اور تمدنی ضرورت کے تحت۔

مگر اَب صورتحال بدلی ہوئی ہے، امت مسلمہ فکر وعقیدہ کے اعتبار سے جاں بلب ہوچکی ہے، اَب مسلمان اپنی شامتِ اعمال سے زوال وانحطاط کا شکار ہیں، اُن کی اپنی تہذیب وثقافت، اور اخلاق ومعاشرت کا کوئی معیار باقی نہیں رہ گیا ہے، وہ خود دوسروں سے مرعوب ہیں، دوسروں کی تہذیب وثقافت اور اخلاق ومعاشرت کو نعوذ باللہ اپنے لیے نمونہ اور معیار سمجھنے لگے ہیں، اور اِس کے لیے سب سے بڑا ذریعہ غیروں کی زبان، اُن کی تعلیم، اور (مزعومہ) سائنسی ترقیات ہیں، اِس لیے ایسی مرعوبیت کی حالت میں ان چیزوں کی طرف جھانک کر دیکھنا بھی انتہائی خطرناک ہوسکتا ہے، جاں بلب مریض کو انتہائی

نگہداشت (آئی،سی،یو) میں ہی رکھا جاتا ہے، باہر کی فضائی آلودگی اس کے لیے کس قدر مہلک ہے، یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں۔

یہ کتنی عبرت کی بات ہے کہ حضرت نانوتویؒ کے دور سے اَب تک جن حضرات نے بھی ''جدید اُسلوب'' میں اہل باطل کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہے، اپنی نیک نیتی کے باوجود وہ حضرات فکری لحاظ سے ''تجدد'' کی کم از کم آنچ اور دھویں سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکے (الا ماشاء اللہ)۔

کسی نے غیب کا انکار یا استہزاء کیا، کسی نے نصوص شرعیہ سے چھیڑ چھاڑ کی، کسی نے معجزات کا انکار یا بے جا تاویلات کیں، کسی نے اسلامی سادگی اور بے تکلفی پر تبصرے کیے، کسی نے سلف کو مطعون کیا، کسی نے صحابہ پر تنقید کی، کسی نے فقہ کا مذاق اڑایا، کسی نے تصوف اور تقلید کو نشانہ بنایا..... وغیرہ وغیرہ، یہ سب چیزیں ''جدت پسندی'' (انگریزی تعلیم وتہذیب، اور سائنسی مزاج) کے لازمی نتائج میں سے ہیں۔

ایسے میں اگر اکابر دیوبند وسہارنپور ''جدید دور کے جدید تقاضوں'' کے خوش نما عنوان سے خدانخواستہ ذرا بھی متاثر ہو گئے ہوتے، جیسا کہ دیگر حلقے چاہتے تھے، اور اس کے لیے پورا زور صرف کر رہے تھے، تو اِسلام کو اُس کی اصل شکل میں برتنے والے شاید انگلیوں پر بھی پورے نہ ہو پاتے، مگر بتوفیقہ تعالی دینی مدارس کے اپنے ''فرسودہ نصاب ونظام'' پر جمود (یا استقامت) نے اہل باطل کی ساری کوششیں ناکام بنا دیں، اور الحمد للہ مسلمانوں کی زندگیوں میں وہی دین پوری قوت اور تازگی کے ساتھ باقی رہ گیا جو اَب سے چودہ سو تیس سال قبل مکمل ہو چکا تھا، اُس میں نہ کسی سائنسی تحقیق سے استفادے کی ضرورت پڑی، نہ کسی جدید تہذیب وثقافت کے اضافے کی (جیسا کہ ایک صاحب نے اسلام میں ''تدریج'' کی بات کہی ہے، نعوذ باللہ)، نہ کسی نئی زبان کی تعلیم کی، اور نہ رفتارِ زمانہ کا ساتھ دینے کی۔ **فللّٰہ الحمد، و لہ الشکر۔ ''الحمد للہ الذي ھدانا لھذا و ما کنا لنھتدی لو لا أن ھدانا اللہ''**۔ (باقی آئندہ)

مقام صحابہ

مولانا شفیق احمد قاسمی اعظمی
ڈائریکٹر پاسبانِ علم وادب، امام وخطیب مسجد وزارۃ اوقاف، ابوظبی

صحابی کی تعریف

علماء متقدمین ومتاخرین نے صحابی کی تعریف میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر اس صاحب ایمان شخص کو صحابی کہا جائے گا جسے ایمان کی حالت میں خاتم النّبیین محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف ملاقات حاصل ہو، اور اسی ایمان کے ساتھ وفات پائی، اور ظاہر ہے کہ وہ نابینا حضرات یا صحابہ کے نومولود بچے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارکہ میں لائے گئے ان سب کو ملاقات حاصل ہے لہٰذا بلاتردد جماعت صحابہ میں ان کا شمار ہوگا۔

اس طرح کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم کا پاکیزہ گروہ اس زمرہ میں شمار کیا جاتا ہے جس کے بارے میں علماء اہل سنت والجماعت اور ائمہ سلف کا بالاتفاق قول ہے کہ سب کے سب نجوم ہدایت ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **اَصْحَابی کالنُّجوم بأيهم اقتديتم اهتديتم.** (ترمذی) گروہ صحابہ کا وجود، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک عظیم الشان معجزہ ہے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ومحبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمگیر پیغام رسالت کو خطۂ ارضی کے ہر گوشہ تک اس کی حقیقی روح کے ساتھ پھیلایا اور اس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا رحمۃ للعالمین ہونا بھی ثابت کردیا اور **وما ارسلناک الا کافۃ للناس** (سورہ فاطر: ۲۴) کی تفسیر بھی دنیا کے سامنے پیش کردی گئی۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پاکیزہ و برگزیدہ جماعت کے ذریعہ اسلام کا

تعارف بھی کرادیا گیااور رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور سنت کو عام کیا گیا۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو الگ رکھ کر ان کو عام انسانوں کی طرح خاطی وعاصی تصور کر کے غیر معتبر قرار دیا جائے گا تو اسلام کی پوری عمارت ہی منہدم ہوجائے گی نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت معتبر رہے گی نہ قرآن اور اس کی تفسیر اور حدیث کا اعتبار باقی رہے گا، کیونکہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ من جانب اللہ ہم کو عطاء کیا ہے وہ ہم تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کی معرفت پہنچا ہے، خود معلم انسانیت محمد عربی نے اپنے جاں نثار، اطاعت شعار صحابہ کی تربیت فرمائی تھی۔

صحابہ کرام نے اوّل اوّل، زبان رسالت سے آیات اللہ کو ادا ہوتے سنا تھا اور کلام رسول کی سماعت کی تھی پھر دونوں کو دیانت وامانت کے ساتھ اسی لب ولہجہ اور مفہوم ومعانی کے ساتھ محفوظ رکھا اور بحکم رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دوسروں تک پہنچایا کیونکہ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تبلیغ کا مکلف بنایا تھا... بَلِّغُوْ عَنِّی وَلَوْ آیۃً (بخاری ومسلم) میری جانب سے لوگوں کو پہنچادو اگر چہ ایک آیت ہی ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو درسگاہ نبوت میں حاضری کا مکلف ایک خاص حکم کے ذریعہ بنایا تھا کہ ہر وقت ایک متعدبہ جماعت اللہ کے رسول کی خدمت میں اسلام سیکھنے کیلئے حاضر رہے، اس لئے کہ کب کوئی آسمانی حکم اور شریعت کا کوئی قانون عطا کیا جائے، لہٰذا ایک جماعت کی آپ کی خدمت میں حاضری لازمی تھی اور ان کو بھی حکم تھا کہ جو حضرات خدمت رسالت میں موجود نہیں ہیں ان تک ان نئے احکام اور آیات کو پہنچائیں۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً فَلَوْلاَ نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُم طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (سورہ توبہ:۱۲۲)

اور مسلمانوں کو نہیں چاہئے کہ سب کے سب چلے جائیں، تو کیوں نہ ہر فرقہ میں سے نکلی ایک جماعت جو مہارت ورسوخ حاصل کرتی دین میں اور تا کہ ڈرائیں اپنی قوم کو جب

کہ وہ لوٹ کر آئیں ان کے پاس، ہوسکتا ہے کہ وہ ڈریں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ صحابہ کرام سے محبت وعقیدت کے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت نہیں ہوسکتی اور صحابہ کرام کی پیروی کئے بغیر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا تصور محال ہے، کیونکہ صحابہ کرام نے جس انداز میں زندگی گزاری ہے وہ عین اسلام اور اتباع سنت ہے اور ان کے ایمان کے کمال وجمال، عقیدہ کی پختگی، اعمال کی صحت واچھائی اور صلاح وتقویٰ کی عمدگی کی سند خود رب العالمین نے ان کو عطا کی ہے اور معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قولِ پاک سے اپنے جاں نثاروں کی تعریف وتوصیف اور ان کی پیروی کو ہدایت وسعادت قرار دیا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی انسان تھے ان سے بھی بہت سے مواقع پر بشری تقاضوں کے تحت لغزشیں ہوئی ہیں لیکن لغزشوں، خطاؤں، گناہوں کو معاف کرنے والی ذات اللہ کی ہے اس نے صحابہ کرام کی اضطراری، اجتہادی خطاؤں کو صرف معاف ہی نہیں کیا بلکہ اس معافی نامہ کو قرآن کریم کی آیات میں نازل فرما کر قیامت تک کیلئے ان نفوس قدسیہ پر تنقید وتبصرہ اور جرح وتعدیل کا دروازہ بند کردیا، اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے ایمان کی صداقت اور اپنی پسندیدگی کی سند بھی بخشی ہے، اس کے بعد بھی اگر کوئی فرد یا جماعت صحابہ کرام پر نقد وتبصرہ کی مرتکب ہوتی ہے تو اس کو علماء حق نے نفس پرست اور گمراہ قرار دیا ہے، ایسے افراد اور جماعت سے قطع تعلق ہی میں خیر اور ایمان کی حفاظت ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری جماعت (خواہ کبار صحابہ ہوں یا صغار صحابہ) عدول ہے، اس پر ہمارے ائمہ سلف اور علماء خلف کا یقین وایمان ہے، قرآن کریم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متعلق آیات پر ایک نظر ڈالئے پھر ان کے مقام ومرتبہ کی بلندیوں کا اندازہ لگائیے اس کے بعد بھی اگر کسی نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تنقیص کی جرأت کی ہے تو اس کی بدبختی پر کفِ افسوس ملئے۔

صحابہ سراپا ادب اور پیکر تقویٰ تھے

اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَھُم عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُم

لِلتَّقْویٰ لَھُم مَغْفِرۃٌ وَاَجْرٌ عَظِیْمٌ .(سورہ الحجرات:۳)

بیشک جولوگ اپنی آوازوں کورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پست رکھتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کیلئے خالص کردیا ہے، ان لوگوں کیلئے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

کفر وفسق سے محفوظ تھے

وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلُ اللہِ لَو یُطِیْعُکم فِی کَثیرٍ مِنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰکِنَّ اللہ حَبَّبَ اِلَیْکُم الاِیْمَانَ وَزَیَّنَہ فِی قُلُوْبِکُمْ وکَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالعِصْیَانَ اُوْلٰئِکَ ھُمُ الرَّاشِدُوْنَ (سورۃ الحجرات:۷) اور جان رکھو کہ تم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اگر بہت سے کاموں میں تمہاری بات مان لیا کریں تو تم پر مشکل پڑے، لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کی (تحصیل) کو تمہارے دلوں میں مرغوب کردیا اور کفر وفسق اور عصیان سے تم کو نفرت دیدی ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل اور انعام سے راہ راست پر ہیں۔

عبادت کے خوگر اور رحمدل تھے

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہ اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ تَرَاھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِنَ اللہِ وَرِضْوَاناً سِیْمَاھُم فِی وُجُوْھِھِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (سورہ فتح:۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جولوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں، اے مخاطب تو ان کو دیکھے گا کہ کبھی رکوع کررہے ہیں کبھی سجدہ کررہے ہیں اور اللہ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں ان کی (عبدیت) کے آثار سجدوں کی تاثیر سے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب سورہ فتح کی تفسیر کرتے ہوئے معارف القرآن جلد ۸ میں تحریر کرتے ہیں:

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں اس کی تصریحات ہیں جن میں چند آیات اسی سورت میں آچکی ہیں: لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ، اور اَلْزَمَھُمْ کَلِمَۃَ التَّقْوٰی وَ کَانُوا اَحَقَّ بِھا وَ اَھْلَھا، انکے علاوہ بہت سی آیات میں یہ مضمون مذکور ہے، یَومَ لاَ یُخْزِ اللّٰہُ النَّبِیَ وَ الَّذِیْنَ آمَنُوْ مَعَہ وَ السَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ المُھَاجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِیْنَ اِتَّبَعُھُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ وَ اَعَدَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ اور سورہ حدید میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کے بارے میں فرمایا ہے: وَ کُلاًّ وَّعَدَ اللّٰہُ الحُسْنٰی.

یعنی ان سب سے اللہ تعالیٰ نے حسنیٰ کا وعدہ کیا ہے پھر سورہ انبیاء میں حسنیٰ کے متعلق فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَھُمْ مِنا الحُسْنٰی اولئک عَنھَا مُبْعَدُوْنَ یعنی جن لوگوں کیلئے ہماری طرف سے حسنیٰ کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے وہ جہنم کی آگ سے دور رکھے جائیں گے۔

صحابہ پر طعنہ زنی جائز نہیں

امام المفسرین علامہ قرطبی اپنی مشہور ومعروف تفسیر قرطبی جلد نمبر ۱۶، ص ۳۲۲: پر رقم طراز ہیں: یہ جائز نہیں کہ کسی بھی صحابی کی طرف قطعی اور یقینی طور پر غلطی منسوب کی جائے اس لئے کہ ان سب حضرات نے اپنے اپنے طرز عمل میں اجتہاد سے کام لیا تھا اور ان سب کا مقصد اللہ کی خوشنودی تھی یہ سب حضرات ہمارے پیشوا ہیں اور ہمیں حکم ہے ان کے باہمی اختلافات میں کف لسان کریں اور ہمیشہ ان کا ذکر بہتر طریقہ پر کریں، کیونکہ صحابیت بڑی حرمت (وعظمت) کی چیز ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو برا کہنے سے منع فرمایا ہے اور یہ خبر دی ہے کہ اللہ نے انہیں معاف کر رکھا ہے اور ان سے راضی ہے۔ (بحوالہ معارف القرآن)

ہر مشکل کا حل اتباع صحابہ

آج ہم مسلمانوں کو عالمگیر سطح پر مشکلات کا سامنا ہے، ہر محاذ پر ناکامی اور پسپائی ہے، دشمنان اسلام متحد اور اسلام کو مٹانے پر متفق ہیں، مسلمانوں پر طرح طرح سے الزامات اور

بہتان تراشی ہورہی ہے، پوری دنیا میں اسلام کی شبیہ کو خراب کرنے اور مسلمانوں کو بدنام کرنے میں میڈیا سرگرم ہے، یورپ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی لہر چل رہی ہے، ہم ایک خطرناک اور نازک دور سے گذر رہے ہیں، ان حالات میں صحابہ کرام کی مثالی زندگی ہمارے لئے مشعل راہ ہے، ان پاکیزہ نفوس کو بھی ان حالات کا سامنا تھا، بلکہ بعض اعتبار سے آج کے حالات سے زیادہ خطرناک صورتِ حال تھی، مکہ میں ابتلاء وآزمائش کے شدید دور سے گذرتے تھے، تعداد بھی کم تھی اور وسائل بھی نہیں، حدیبیہ میں یہودیوں اور منافقوں کی فتنہ انگیزیاں اور سازشیں تھیں، مشرکین مکہ کے حملے اور یہودی قبائل سے لڑائیاں تھیں، پھر دائرہ وسیع ہوا تو قیصر روم اور کسریٰ کے خطرناک عزائم تھے، ان سب حالات کا مقابلہ صحابہ کرام نے جس حکمت عملی اور صبر واستقامت سے کیا، وہی تاریخ ہم کو دہرانی پڑے گی، اس لئے ضروری ہے کہ ہم سیرتِ صحابہ کا مطالعہ کریں ان کو اپنا رہنما ومقتدا جان کر اِس محبت وعقیدت سے ان کی پیروی کریں کہ ان کا ہر عمل اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک پسندیدہ ہے، صحابہ ہمارے لئے معیار حق اور مشعل راہ ہیں، ان کی شان میں کسی قسم کی گستاخی گوارہ نہیں، ان کی عظمت شان کی بلندیوں تک کسی کی رسائی نہیں، عصر حاضر میں ان حضرات کی پیروی گذشتہ صدیوں کے مقابلہ میں زیادہ ضروری اور اہم ہے اور کامیابی کا تصور اس کے بغیر ممکن نہیں۔

میں نے چند آیات کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے ورنہ ان کے علاوہ اور بہت سی آیات میں ان کے فضائل ومناقب بیان کئے گئے ہیں جبکہ کتب احادیث میں مناقب صحابہ ایک مستقل باب ہوتا ہے، جس میں انفرادی طور پر کبار صحابہ کے مناقب بھی ہیں اور مجموعی طور پر تمام اصحاب رسول کی عظمت وجلالت کا ذکر بھی ہے۔ ٭٭٭

تقلید کی حقیقت

مولانا محمد اکرم بستوی استاذ شعبۂ تحفظ ختم نبوت جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

اللہ پاک نے بنی نوع انسان کی ہدایت، رہبری و رہنمائی کے لئے حضرات انبیاء کرام کا مبارک سلسلہ جاری فرمایا جس کی پہلی کڑی سیدنا حضرت آدم علیہ السلام اور آخری کڑی امام الانبیاء، خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، حضرات انبیاء علیہم السلام نے بحکم خداوندی لوگوں کو یہ پیغام دیا کہ عبادت کے لائق صرف اللہ ہی کی ذاتِ گرامی ہے، اسی کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے اور اسی میں دارین کی کامیابی تصور کرتے ہوئے احکامات خداوندی کو حرزِ جان بنایا جائے۔

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال و افعال سے احکامات خداوندی کی ترجمانی، اس کی تشریح وتوضیح فرمائی ہے اور حلال وحرام، جائز ناجائز کی حقیقت کو واضح فرمایا ہے، اس لئے رسول اللہ کی اطاعت بھی ضروری ہوگی، اور یہ اطاعت درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت ہے، "**من یطع الرسولَ فقد أطاع اللہ**" تمام امور میں چاہے از قبیل عقائد ونظریات ہوں یا حقوق و معاملات، سب میں آپ کی اتباع لازم اور آپ کے فیصلے کو ٹھنڈے دل سے قبول کرنا ضروری ہوگا، بلکہ اللہ پاک نے آپ کے فیصلے کو کفر واسلام کا معیار اور حق و باطل کی کسوٹی قرار دیا ہے، ارشاد ربانی ہے: **فلا و ربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی أنفسھم حرجاً مما قضیت و یسلموا تسلیماً** (سورہ نساء: ۶۵) سو قسم ہے تیرے رب کی، وہ مومن نہ ہونگے، یہاں تک کہ تم کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلے سے، اور قبول کریں خوشی سے، (شیخ الہند)

لہٰذا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ دنیا و آخرت کی کامیابی کا راز قرآن وسنت

کے احکامات کی تابعداری میں مضمر اور اللہ و رسول کی اطاعت میں پوشیدہ تصور فرمائے اور ان دونوں کے بتائے ہوئے طور وطریق کو لائحۂ عمل بنا کر مژدۂ جاوداں کا مستحق ہو۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قرآن وحدیث میں مذکور بعض احکام ایسے ہیں جن کو دیکھ کر ایک اوسط درجہ کا علم رکھنے والا آدمی بھی اول وہلہ میں سمجھ لیتا ہے اور مقصد تک اس کی بآسانی رسائی ہوجاتی ہے اور اسے کسی قسم کا کوئی خلجان اور دشواری پیش نہیں آتی ،اس کے برخلاف قرآن وحدیث میں مذکور بہت سے احکامات ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں کچھ ابہام ہوتا ہے،اور بعض دفعہ ادلہ سے ثابت ہونے والے احکامات باہم ایک دوسرے سے متعارض محسوس ہوتے ہیں،اب ایسی صورت میں قرآنی آیات اور نبوی ہدایات سے احکام ومسائل کا سمجھنا نہایت دقت طلب اور دشوارترین مرحلہ ہوتا ہے جس تک ہر کس وناکس کی رسائی ناممکن ہوتی ہے،اب ایسی صورت میں دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں۔

پہلی صورت یہ کہ انسان اپنے ذہن ودماغ پر اعتماد کرتے ہوئے غور وتدبر کے بعد جس نظریہ پر پہونچے اسی پر عمل پیرا ہوجائے ،اس کے نقصانات اور مہلک نتائج کا کون منکر ہوسکتا ہے؟

دوسری صورت یہ ہے کہ انسان از خود عقل سے فیصلہ کرنے کے بجائے اس میدان کے شہسواروں، راسخین فی العلم، ماہرین فن اور بالخصوص خیر القرون کے ان اکابر(جنھوں نے اپنی پوری عمر مسائل کے استخراج واستنباط میں صرف کیں، ان) کی فہم وفراست پر اعتماد کرے اور ان کی فہم پر بھروسہ کرکے اس پر عمل پیرا ہو، ظاہر ہے کہ یہ صورت اپنے اندر احتیاط کا پہلو لئے ہوئے ہے۔

ہمارے اسلاف، صحابۂ کرام جن کے گھر، ماحول اور واقعات میں قرآن کا نزول ہوا، یا وہ علماء کرام جنھوں نے ان مبارک ہستیوں سے کسبِ فیض کیا، یا وہ اکابر جنھوں نے دین فہمی کے لئے اپنی زندگی وقف کردی ، ان کے لئے قرآن وحدیث کی مراد کو سمجھنا ، نتائج تک پہونچنا آسان تھا ، ان کے علم وفہم ،تقویٰ وطہارت پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے بتائے ہوئے طریقے کو بروئے کار لانے کا نام ہی تقلید ہے،خلاصہ یہ کہ تقلید میں اتباع؛ قرآن و حدیث ہی کی ہوتی ہے،البتہ مقاصد تک رسائی میں امام کو شارح کی حیثیت دی جاتی ہے

جو ہمارے لئے منزل مقصود کی نشاندہی کرتا ہے۔

یہ حقیقت ایک مثال کے ذریعہ مزید آشکارا ہوجاتی ہے، جسے فقیہِ وقت مفتی عبدالرحیم لاجپوری نے اپنی کتاب ''تقلید کی شرعی ضرورت'' میں ان الفاظ میں تحریر فرمایا ہے:

''تقلید کی حیثیت صرف یہ ہے کہ تقلید کرنے والا اپنے امام کی تقلید یہ سمجھ کر کرتا ہے کہ وہ دراصل قرآن وسنت پر عمل کرتا ہے اور صاحبِ شریعت ہی کی پیروی کررہا ہے اور گویا یہ تصور کرتا ہے کہ امام اس کے اور صاحبِ شریعت کے درمیان واسطہ ہے، مثال کے طور پر نماز باجماعت ادا کی جارہی ہو اور جماعت بڑی ہو، امام کی آواز مقتدیوں کو سنائی نہ دیتی ہو تو اس وقت مکبِّر مقرر کئے جاتے ہیں، وہ مکبر امام کی اقتدا کرکے بلند آواز سے تکبیر کہہ کر امام کی نقل وحرکت، رکوع وسجود کی اطلاع پچھلی صف والوں کو دیتا ہے اور پچھلی صف والے یہی سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے امام ہی کی اقتدا کررہے ہیں، یہ مکبر تو صرف واسطہ ہے جو ہمیں امام کی نقل وحرکت کی اطلاع دے رہا ہے اور مکبر بھی یہی سمجھتا ہے کہ میں خود امام نہیں ہوں بلکہ میرا اور پوری جماعت کا امام صرف ایک ہی ہے، بالکل یہی صورت یہاں ہے کہ مقلد کا تصور یہی ہے کہ میں خدا ورسول ہی کے اطاعت اور اتباع کررہا ہوں، امام کو درمیان میں بمنزلۂ مکبر تصور کرتا ہے، اس کو مستقل بالذات مطاع نہیں سمجھتا، مستقل بالذات مطاع تو صاحبِ شریعت ہی کو سمجھتا ہے۔ (ص: ۵۲)

جب صورت حال یہ ہے تو پھر تقلید اور اتباع کو شرک، ضلالت وگمراہی کا راستہ کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے؟

اسلاف پر اعتماد کامیابی کی کلید ہے

صراطِ مستقیم کی طلب ہر مسلمان کی چاہت ہوتی ہے، پورا قرآن کریم صراطِ مستقیم کی تشریح اور تعلیماتِ رسول اسی صراطِ مستقیم کی تفصیل ہیں، مگر چونکہ صرف کتابیں انسانی تربیت کے لئے

کافی نہیں ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہمیشگی اور دوام وجاودانی دنیا میں حاصل نہیں ہے، اس لئے جن لوگوں کے ذریعے صراطِ مستقیم حاصل ہوسکتا ہے اس فہرست میں انبیاء کے علاوہ صدیقین، شہداء، صالحین کو داخل فرما کر اِن رجال اللہ کی اتباع و پیروی کو کامیابی کی کلید قرار دیا، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر حضرات صحابۂ کرام کو پچھلی امتوں کے حالات سے باخبر کرتے ہوئے مطلع فرمایا: **إن بني اسرائيل تفرقت على ثنتين و سبعين ملة و تفترق امتي على ثلاث و سبعين ملة كلهم في النار إلا ملة واحدة، قالو من هي يا رسول الله! قال ما أنا عليه و اصحابي** (ترمذی ۲؍۹۳) کہ میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی اور ان میں صرف ایک جماعت حق پر ہوگی اور وہی کامیابی سے ہمکنار ہوگی، صحابۂ کرام کے استفسار پر آپ نے رجال اللہ (اللہ والوں) کا پتہ دیتے ہوئے فرمایا: **ما أنا عليه و أصحابي** ''حق پر وہ جماعت ہوگی جو میرے اور صحابہ کے طرز پر گامزن ہوگی''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہدایت یافتہ جماعت کی نشاندہی فرماتے ہوئے ما انا علیہ واصحابی فرمانا رجال اللہ سے تعلق اوران کی اتباع کا پیغام دیتا ہے کہ حقیقی کامیابی صرف کتاب کے پڑھنے اور قرآن وحدیث کے مطالعہ کر لینے سے نہیں ہوسکتی بلکہ حقیقی تعلیم وتربیت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کسی ماہر، بافیض اور مردِ کامل سے استفادہ نہ کیا جائے اور اس کی ذات پر اعتماد نہ کیا جائے۔

اگر اخلاف اپنے اسلاف پر اعتماد نہ کریں تو ان کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے گا اور وہ مارے مارے پھریں گے اور انسانی بود و باش کی خصوصیات اور علوم وفنون سے تہی دامن ہونگے۔

درحقیقت اعتماد واعتبار وہ گرانمایہ سرمایہ ہے جو شریعت کی جڑ اور بنیاد ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ انسان کی کامیابی کے لئے کتاب اللہ اور رجال اللہ دونوں سے وابستگی اور ان پر اعتماد کلی کا ہونا ضروری ہے، کتاب اللہ جس میں انسانی زندگی سے متعلق تمام احکام موجود ہیں، رجال اللہ سے اسے سیکھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔

گمراہی کا بڑا سبب: کچھ لوگوں نے صرف کتاب اللہ کو لیا اور اس سے تعلقات مستحکم کرنے کا دم بھرا، اہل اللہ سے رشتہ توڑ لیا، اور دوسرے کچھ لوگوں نے رجال اللہ ہی کو سب کچھ سمجھ لیا اور کتاب اللہ سے صرفِ نظر کرلیا، ایسی دونوں جماعتوں کا نتیجہ گمراہی کے سوا کچھ نہ نکلا، اس کے بالمقابل اسلام کی صحیح تعلیم یہ ہے کہ کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑا جائے اور اہل اللہ کے دامن سے وابستہ ہوا جائے، گویا کتاب اللہ اور رجال اللہ دونوں ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں، جب دونوں درست ہونگے، اور ایک کا دوسرے سے تال میل ہوگا تو منزلِ مقصود تک بآسانی رسائی ہوسکتی ہے۔

تقلید کی حقیقت: تقلید کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ کسی مجتہد کو قرآن وحدیث کا ماہر اور نکتہ داں سمجھ کر محض حسنِ ظن اور اعتقاد کی بنا پر کسی دلیل کے مطالبہ کے بغیر اس کے قول و فعل کو شریعت کا حکم سمجھا جائے، اور یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ تقلید معرفتِ دلیل کے منافی نہیں ہے، اگر کوئی مقلد مسائل فقہیہ کی دلیل سے واقفیت حاصل کرلے تو تقلید کی شاہراہ سے باہر نہیں ہوتا، گویا مقلد کا جاہل اور بے علم ہونا ضروری نہیں۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تقلید ایک فطری چیز ہے، دنیا کا کوئی بھی کام مثلاً سِلائی، کڑھائی، کھانا پکانا وغیرہ، سیکھنے والا جب تک اس کام کے بڑوں کی اتباع واقتداء نہ کرکے صرف مذکورہ فنون کی کتابیں دیکھ کر فن کا ماہر بننا چاہے تو ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔

بلکہ اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ غیر مقلدین خود بھی تقلید سے بچے ہوئے نہیں ہیں، ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ مقلدین خیر القرون کے اکابر کی تقلید کرتے ہیں اور یہ نام نہاد اہلِ حدیث، موجودہ زمانے کے اپنے علماء اور ان کی بتائی ہوئی باتوں کی۔

امت کا سوادِ اعظم اس بات پر متفق ہے کہ ائمۂ مجتہدین اربعہ کو شارحِ شریعت سمجھ کر ان پر اعتماد کیا جائے اور اسی میں کامیابی تصور کی جائے اور حضراتِ صحابہ واسلاف سے حسنِ ظن رکھا جائے، اسی میں ایمان وعمل کا تحفظ وبقا اور ضلالت وگمراہی سے حفاظت ہے۔

٥

فتاویٰ

انتخاب وترتیب: عبداللہ خالد قاسمی خیرآبادی

پراپرٹی ڈیلر کی اجرت

پراپرٹی ڈیلر کا اجرت لینا جائز ہے بشرطیکہ اجرت متعین ہو، اس میں کسی قسم کی جہالت نہ ہو اور اگر اجرت جانبین سے لے تو معاملہ طے کرنے سے پہلے کہہ دے کہ میں اجرت دونوں سے لوں گا۔

نیز پراپرٹی ڈیلر کے لیے صرف متعین اجرت لینا ہی درست ہے کسی اور طریقے سے ملنے والی زائد رقم لینا جائز نہیں۔ مثلاً کوئی شخص کہے کہ میری یہ چیز ایک ہزار کی بیچ دو۔ اب یہ ڈیلر اس چیز کو ڈیڑھ ہزار روپے کی بیچ دیتا ہے تو اس کے لیے یہ اوپر والے پانچ سو روپے لینا جائز نہیں، بلکہ یہ مالک کو ہی لوٹانے ہوں گے اور یہ ڈیلر خود صرف متعین اجرت کا ہی مستحق ہوگا۔

بارات کی شرعی حیثیت

انعقاد نکاح کے لیے بارات نہ تو سنت ہے اور نہ ہی واجب یا فرض۔

موجودہ دور میں یہ امر ایک لعنت کے طور پر معاشرے کی گردن پر مسلط ہو چکا ہے، اگر جانبین متفق ہو کر ذیل کی خرابیوں سے بچتے ہوئے سادگی سے عمل نکاح کو سرانجام دے لیا کریں تو یہ بہت ہی خیر کا باعث ہوگا۔

بارات میں عموماً نامحرم مرد اور عورتوں کا اختلاط، تصویر اور وڈیو گرافی، فخر وریا اور دکھلاوا یہ سارے امور شرعاً ناجائز ہیں۔ جن کا ترک کرنا واجب ہے۔

ان بیہودہ رسوم اور خرافات کو ختم کر کے اسلامی انداز میں سادگی سے نکاح کیا جائے اسی میں خیر وبھلائی اور دنیا وآخرت کی کامیابی ہے۔